آؤ لوگو کہ یہیں نور خدا پاؤ گے ٭ لو تمہیں طور تسلی کا بتایا ہم نے

ریویو آف ریلیجنز

یعنے

دنیا کے مذاہب پر نظر

جلد ۵ | بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ء | نمبر ۱۰

فہرست مضامین

قادیان ضلع گورداسپور سے - ۲۰ - اکتوبر سنہ ۱۹۰۷ء کو مینجر میگزین کے اہتمام سے شایع ہوا - چندہ سالانہ ۲ع

رؤیا و الہامات حضرت مسیح موعود علیہ السلام

۱۵ ستمبر ۱۹۰۶ء فرمایا۔ گھر میں ایک چوکھٹ کے اندر ایک کتبہ لگا ہوا ہے جس پر لکھا ہے رب کل شیء خادمک۔
ہم نے آج کشفی نگاہ میں دیکھا کہ وہ الفاظ مٹے ہوئے ہیں۔ مگر اس پر لکھا ہے تجبیر۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۰۶ء (روز دوشنبہ)
(۱) قال ربک انہ نازل من السماء ما یرضیک۔ وما نتنزل الا بامر ربک۔ ترجمہ۔ تیرے رب نے
فرمایا ہے کہ آسمان سے ایک ایسا امر اترنے والا ہے جو تجھے خوش کر دیگا۔ اور ہم تیرے رب کے حکم کے سوائے
کبھی نازل نہیں ہوتے۔ (۲) قد سمع اللہ۔ اجیبت دعوتک۔ ان اللہ مع الذین اتقوا والذین ھم
محسنون۔ ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ نے تیری دعا سن لی۔ تیری دعا قبول کی گئی۔ اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کے ساتھ ہے
جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور وہ جو نیکی کرتے ہیں۔ (۳) بارک اللہ فی الھامک و وحیک و رؤیاک۔ ترجمہ
برکت دی اللہ تعالیٰ نے تیرے الہام میں اور تیری وحی میں اور تیری خوابوں میں۔ (۴) للذین آمنوا رحمۃ وکتبت
لک رحمۃ فی الدنیا والآخرۃ ترجمہ۔ تجھ پر ایمان لانیوالوں کیلئے رحمت لکھدی ہے۔ اور تیرے لیے دنیا اور آخرت
میں رحمت لکھدی ہے۔ (۵) نزید فی رحمتک وصدقک ووفاءک (ای نزید برکات)
(یہ خدا کی طرف سے نہیں صرف تفہیم ہے میرے لفظوں میں) ترجمہ۔ تیری رحمت اور صدق اور وفا میں ہم زیادتی
کریں گے یعنی تجھ پر برکات میں زیادتی کیجائے گی۔ (۶) کل مکتب یجاء۔ یا ایھا العزیز مسنا واھلنا
الضر وجئنا ببضاعۃ مزجاۃ فاوف لنا الکیل وتصدق علینا۔ ان اللہ یجزی
المتصدقین۔ ترجمہ۔ سب مکتب آئے اور کہیں گے۔ اے عزیز ہم اور ہمارے اہل دکھیاں تکلیفات میں
ہیں۔ اور ہم تھوڑی سی پونجی لائے ہیں نہیں ہمیں پورا ماپ تول دے۔ اور ہم پر صدقہ کر تحقیق اللہ تعالیٰ صدقہ
کرنیوالوں کو جزائے خیر دیتا ہے (۷) ما انا الا کالقرآن وسیظہر علی یدی ما ظہر من الفرقان۔
ترجمہ۔ میں تو بس قرآن ہی کی طرح ہوں اور قریب ہے کہ میرے ہاتھ پر ظاہر ہوگا جو کچھ کہ فرقان سے ظاہر ہوا (۸) رؤیا
دیکھا کہ میں ایک فراخ اور خوبصورت اور چمکدار چوغہ پہنے ہوئے چند آدمیوں کے ساتھ ایک طرف جا رہا ہوں۔
اور وہ چوغہ میرے پاؤں تک لٹکتا ہوا ہے اور چمک کی شعاعیں اُس میں سے نکل رہی ہیں (۹) خدا اُسکو پنج بار ہلاکت
سے بچائے گا۔ (نہ معلوم کس کے حق میں یہ الہام ہے) (۱۰) رؤیا۔ دیکھا کہ ایک بھونچال آیا۔ کچھ دہشتناک
معلوم ہوا۔ اور ہم خیمہ کے نیچے سے باہر آ گئے۔ مبارک میرے ساتھ تھا۔ اور خفیف خفیف بارش کے قطرے خوشنما
برس رہے تھے۔ (۲۴) ستمبر ۱۹۰۶ء۔ مطابق پنجم شعبان ۱۳۲۴ھ بروز پیر۔ موت۔ تیرہ ماہ حال کو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

جمع حدیث

گذشتہ رسالے میں جو حدیث پر مضمون لکھا گیا تھا اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سو سال بعد تک حدیث کی تاریخ مختصر طور پر لکھی گئی تھی اور یہ دکھایا گیا تھا کہ اس زمانہ میں حفاظت حدیث کیا کیا اسباب پیدا ہوئے۔ پس ایک صفحہ میں جمع حدیث کا کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کئی صحابہؓ اسوقت اس کام میں نہایت سرگرمی سے مصروف تھے کہ آپ کی احادیث کو یاد کریں اور دوسروں تک پہنچائیں۔ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد جمع حدیث کا کام اور بھی زیادہ شوق اور دلچسپی سے کیا جانے لگا۔ جیسا کہ گذشتہ مضمون میں بہت سی مثالیں بیان کر کے دکھایا ہے کہ کسطرح ایک ایک حدیث کی خاطر بعض صحابہؓ نے بڑی بڑی مشقتیں اُٹھا کر لمبے لمبے سفر کیے اور شام اور مصر تک پہنچے۔ اصل میں یہ سب کوششیں حدیث کے جمع کرنے کیلئے ہی تھیں۔ یہ بھی پچھلے مضمون میں دکھایا جا چکا ہے کہ بعض صحابہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی تحریری یادداشتیں حدیثوں کی لکھ لیا کرتے تھے اور آپ کی وفات کے بعد احادیث کا تحریر میں لانا اور بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ حضرت ابو بکرؓ کے وقت میں زکوٰۃ کے متعلق تمام احکام لکھے ہوئے تھے۔ جیسا کہ حضرت انسؓ کی حدیث سے پایا جاتا ہے کہ آپ انہی احکام کی نقل کر کے عاملوں کو بھیجا کرتے تھے۔ پس جب ہم یہ کہتے ہیں کہ جمع حدیث کا کام ایک سو سال بعد شروع ہوا تو اسوقت نہ تو ہمارا یہ منشاء ہوتا ہے کہ اس سے پہلے حدیث کی حفاظت کا کوئی سامان نہ تھا اور نہ ہی یہ منشاء ہوتا ہے کہ اس سے پہلے محدثین موجود نہ تھے جو حدیثوں کو جگہ جگہ سے تلاش کر کے جمع کرتے اور پھر یہ مجموعہ دوسروں کو سکھاتے تھے اور نہ ہی یہ منشاء ہوتا ہے کہ اس سے پہلے حدیث کا لکھا جانا ثابت نہیں بلکہ اُسوقت جمع حدیث سے ہمارا منشاء تدوین حدیث ہوتا ہے یعنی احادیث کا کتابوں میں ابواب کی تقسیم اور ترتیب کے ساتھ لکھے جانا سو انہی آخری معنوں میں جمع حدیث کا کام پہلی صدی ہجری کے اخیر یا اس کے بعد شروع ہوا۔ اور اسکی تکمیل حضرت امام محمد بن اسمٰعیل بخاری علیہ الرحمۃ نے کی جمع حدیث کے ان دو مفہوموں کو عمداً یا غلطی سے گڈ مڈ کر دینے سے حدیث کی صداقت پر بہت سے اعتراض پیدا ہوئے ہیں کیونکہ ایک طرف تو کہدیا جاتا ہے کہ

جمع حدیث کا کام پہلی صدی ہجری کے بعد شروع ہوا اور پھر مراد اس سے یہ لی جاتی ہے کہ گویا اس سے پہلے حدیث کو نہ لوگ اکٹھا کیا کرتے تھے نہ اسکی تعلیم دی جاتی تھی اور نہ ہی اسکی حفاظت کا کوئی سامان تھا۔ پس سب سے اول یہ ضروری ہے کہ جمع حدیث کے ان دو مفہوموں کو اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے۔ اور انکو الگ الگ رکھا جائے۔ اور اس بات کو دل میں بٹھا لیا جائے کہ امام مالک کی مؤطا اور امام بخاری کی صحیح سے پہلے بھی حدیث کو جمع کیا جاتا تھا اور اسکی حفاظت کے سامان موجود تھے اور اس کے درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔

غور سے دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جمع حدیث کا کام پانچ مرحلوں میں سے ہو کر گذرا ہے۔ سب سے اول مرحلہ اسکا زمانہ نبوی ہے۔ اس بات کو میں پچھلے مضمون میں ثابت کر چکا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بہت سے صحابی خاص توجہ اور شوق سے آپ کے اقوال کو جمع کرتے اور آپکے ہر ایک فعل کو نظر غور سے دیکھکر یاد رکھتے تھے یہی سب سے پہلے محدثین تھے جنکا شوق جمع حدیث کا اسقدر بڑھا ہوا تھا کہ آپ حتی الوسع ہر وقت آنحضرت کے ساتھ لگے رہتے اور جمع حدیث کے سوائے آپ کا کوئی شغل نہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپکے لیے دعا بھی کی تھی جس کے بعد حدیثوں کو یاد رکھنے میں خدائے تعالیٰ نے آپ کو خاص قوت بخشی تھی۔ آپکے علاوہ بعض اور صحابی ایسے تھے جنکو آپکے ساتھ تعلقات کی وجہ سے جمع حدیث کا خاص موقعہ حاصل تھا۔ جیسے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت انس بن مالک جو کئی سال تک آپکے خادم رہے۔ اگرچہ صدیقہ کے سوائے اور ازواج مطہرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی تھیں مگر جو قابلیت اللہ تعالیٰ نے صدیقہ کو جمع اور حفاظت حدیث کے لیے دی تھی وہ اوروں میں نہیں پائی جاتی تھی۔ آپ کو ہزارہا شعر ایام جاہلیت کے شعراء کے یاد تھے اور آپ کا حافظہ نہایت قوی تھا۔ اور علم سے خاص دلچسپی اور محبت تھی۔ ایسا ہی بعض اور صحابی تھے جنکو خداداد قابلیت کے علاوہ موقع بھی ایسا ملا تھا کہ وہ جمع اور حفاظت حدیث کا کام کرتے تھے جیسے عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ۔ یہ دونوں نوجوان علم دین میں خاص دلچسپی رکھتے تھے اور بہت سی احادیث انہوں نے جمع کیں اور لوگوں تک پہنچائیں۔ عبداللہ بن عمرو بھی جمع حدیث کا کام کیا کرتے تھے اور ابوہریرہ سے روایت ہے کہ وہ حدیثوں کو لکھ بھی لیا کرتے تھے ایسا ہی کئی اور صحابی تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں حدیثوں کے یاد رکھنے میں بہت شوق ظاہر کرتے تھے۔ اور یہ کام جو وہ کر رہے تھے دراصل جمع حدیث کا بنیادی پتھر تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جمع حدیث نبوی کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ علاوہ ان چند صحابیوں کے جو آپکی زندگی میں ہی جمع حدیث کا کام کرتے تھے ہزارہا اور صحابہؓ تھے اور ان میں بہت سے ایسے تھے جو کوئی نہ کوئی ایسی حدیث یاد رکھتے تھے جو عام طور پر شہرت یافتہ نہیں تھی پس اس مرحلہ پر جمع حدیث کے لیے یہ ضروری تھا کہ ان تمام سرچشموں سے حدیث کو اکٹھا کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک بڑا مشکل کام تھا مگر ضروریات زمانہ نے

اسکو کئی طرح سے آسان کر دیا تھا۔ سب سے اول جیسا کہ ہم پہلے بھی دکھا چکے ہیں ہر ایک صحابی جو کسی حدیث کو یاد رکھتا تھا وہ اسے اپنا مقدم فرض سمجھتا تھا کہ اسے دوسروں تک پہنچاوے۔ کیونکہ انکے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم انہیں دی تھی کہ لیبلغ الشاھد الغائب آنحضرت کی وفات کے تھوڑے دن پیچھے مخبر صادق کی پیشگوئی کے مطابق صحابہؓ دور دراز ملکوں میں پھیل گئے تھے۔ اور ہر جگہ انہوں نے حدیث کا چرچا پھیلا دیا تھا اور جو جو احادیث انکو معلوم تھیں وہ دوسروں تک پہنچا دی تھیں۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں احادیث کی تدریس کا سلسلہ شام مصر وغیرہ ممالک میں پھیل گیا تھا۔ جہاں یہ سلسلہ نسلاً بعد نسل اسوقت تک جاری رہا جب تدوین حدیث کا وہ زمانہ پہنچا کہ محدثین نے جا بجا پھر کر کل احادیث کو کتابوں میں اکٹھا کر دیا۔ دوم آنحضرتؐ کے بعد خلفا کے زمانے میں کئی صحابی ایسے تھے جنہوں نے آنحضرتؐ کے کسی قول کی بنا پر بعض حقوق طلب کیے۔ اور ان حقوق کے دیا جانے یا انکے انکار کے وقت آپ کی بہت سی احادیث کی تصریح ہو گئی اور وہ عام طور پر شہرت پا گئیں۔ مثلاً مغیرہؓ نے ایک حدیث کی بنا پر حضرت ابوبکرؓ سے بعض حقوق طلب کیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے گواہ طلب کیا اور جب آپکا اطمینان ہو گیا کہ واقعی یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے تو آپ نے وہ حقوق اسے عطا فرما دیئے۔ پس اس طرح پر یہ حدیث عام شہرت پا گئی۔ اسی طرح بہت سی حدیثیں جنکا علم پہلے چند اشخاص تک محدود تھا عام طور پر شائع ہوتی اور پھیلتی رہیں اور علم حدیث کے مجموعہ میں شامل ہوتی گئیں۔ سوئم۔ نئی نئی ضرورتیں جو مسلمانوں کی روز بروز بڑھتی ہوئی تعداد میں پیش آتی تھیں بہت سی حدیثوں کی اشاعت کا موجب ہو گئیں کیونکہ جب کبھی کوئی مقدمہ یا تنازعہ یا کوئی امر فیصلہ طلب پیش ہوتا تو قرآن کریم کے بعد سب سے پہلے حدیث کی طرف ہی صحابہؓ رجوع کرتے تھے۔ اور جہاں امر پیش آمدہ پر کوئی حدیث پوری پوری منطبق نہ ہوتی تو اس کے قریب قریب کوئی حدیث تلاش کیجاتی اور اسی پر قیاس کر کے امر پیش آمدہ کا فیصلہ کیا جاتا۔ صاف ظاہر ہے کہ اس صورت میں احادیث کی اچھی طرح پڑتال کی جاتی ہو گی تاکہ عین مطابق واقعہ کوئی حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملجائے اور آپکے فیصلہ کے مطابق فیصلہ ہو جائے۔ جو صحابہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جمع حدیث میں شہرت رکھتے تھے اول انسے مشورہ لیا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ کی باوجود نوجوان ہونیکے محض انکے علم قرآن اور حدیث کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت عزت کیا کرتے تھے اور ایسے معاملات انسے دریافت کر لیا کرتے تھے۔ چہارم۔ ضروریات اور نئے پیش آمدہ امور کو الگ چھوڑ کر صحابہؓ تلاش حدیث میں سرگرم رہتے تھے کیونکہ وہ اسبات کو پسند نہ کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی الفاظ آئندہ نسلوں کو پہنچنے سے رہ جائیں۔ چنانچہ جہاں کہیں کسی حدیث کی روایت کا ذکر سنتے تھے فوراً اس جگہ پہنچکر بعد تحقیق اس حدیث کو اپنے علمی ذخیرہ میں شامل کر کے دوسروں تک پہنچاتے تھے۔ دراصل صحابہؓ کے زمانہ میں جمع حدیث کے لیے اول ان حدیثوں کی اشاعت ضروری تھی

تاکہ عام طور پر معلوم ہو کر وہ حدیثیں محدثین کے ذخیرہ علم میں داخل ہو سکیں۔ پنجم۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کثرت سے لوگ اسلام میں داخل ہوئے اور ان میں سے بہت سے اس بات کی تلاش میں لگے رہتے تھے کہ انہیں اس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ حالات معلوم ہو جائیں جس کے زمانہ کو پا کر وہ اسلام اور آپ کی صحبت سے محروم رہے ایسا ہی دین اسلام کے متعلق بھی وہ پوری واقفیت حاصل کرنا چاہتے تھے اور یہی حال اس نئی اسلامی نسل کا تھا جسکا زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے اسقدر ملا ہوا تھا مگر اس مبارک زمانہ کو انہوں نے نہ پایا تھا۔ یہ تمام لوگ اس تلاش میں رہتے تھے کہ کسی صحابی سے مل کر اس سے حالات سنیں۔ اس ذریعہ سے حدیث کا علم اور بھی اشاعت پاتا رہا۔ پھر جوں جوں صحابہؓ دنیا سے گذرتے گئے ان لوگوں کا اشتیاق احادیث کا علم حاصل کرنے انکو محفوظ رکھنے اور پھیلانے کا اور بھی بڑھتا گیا۔ ان تمام باتوں سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اکثر وہ احادیث جو صحابہؓ کے علم میں تھیں تابعین کو پہنچ گئیں۔ ششم۔ وہ صحابی جن کے پاس احادیث کا ذخیرہ زیادہ تھا جیسے ابوہریرہؓ انس بن مالکؓ ابن عباسؓ وغیرہ وہ تدریس کے طور پر مشتاق طالبوں کو حدیثیں سنایا کرتے تھے۔ اور صحابہؓ کے زمانہ میں ہی ایسے مقامات پر حدیث کی بڑی بڑی درسگاہیں بن گئی تھیں جہاں باقاعدہ حدیث کی اشاعت ہوتی تھی اور دور دور سے سننے والے جمع ہوتے تھے چنانچہ آٹھ سو آدمی حضرت ابوہریرہؓ کے حدیث میں شاگرد تھے۔ ان درسگاہوں کا قایم ہونا جمع حدیث کے دوسرے مرحلہ کا اختتام اور تیسرے مرحلہ کا ابتدا تھا۔

تیسرا مرحلہ جمع حدیث میں اسوقت شروع ہوتا ہے جب صحابہؓ کا زمانہ گذر کر کل احادیث اکابر تابعین کے ہاتھ میں آچکی تھیں۔ پہلی صدی ہجری کے اختتام سے پہلے کل صحابہؓ اس دنیا سے گذر چکے تھے۔ حدیث کی درسگاہیں صحابہؓ کے زمانہ میں ہی قایم ہو چکی تھیں۔ اور اب اس تیسرے مرحلہ پر جمع حدیث کے لیے اسطرح پر تلاش کی ضرورت نہ رہ گئی تھی جیسے صحابہؓ کے وقت میں تھی۔ کیونکہ صحابہؓ کے زمانہ تک نئی نئی احادیث اشاعت پاتی رہتی تھیں۔ مگر اب صرف وہی احادیث آگے پہنچائی جاتی تھیں جو صحابہؓ کے ذریعہ تابعین کو پہنچ چکی تھیں۔ پس عموماً حدیث کی تلاش ان درسگاہوں تک ہی محدود ہو گئی تھی جہاں علم حدیث کا چرچا ہوتا تھا۔ اور بہت کم ایسی حدیثیں تھیں جو ان درسگاہوں میں نہ آگئی ہوں۔ اسطرح پر جہاں تک بانی سلسلہ روایت کی تکمیل ہو سکتی تھی ان درسگاہوں کے قایم ہونے اور ان میں علم حدیث کے پڑھایا جانے سے جمع حدیث کی ایک گونہ تکمیل ہو چکی تھی۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ کسی ایک درسگاہ میں کل کی کل حدیثیں مل سکتی تھیں بلکہ جو احادیث کسی محدث تابعی نے صحابہؓ سے سنکر حفظ کر لی تھیں انہی احادیث کی اشاعت اس درسگاہ میں ہوتی تھی اور پھر سفر کے ذریعہ محدثین کے علم کی وسعت ہوتی رہتی۔ علاوہ ازیں اس زمانہ میں حدیث کا لکھنا پہلے کی نسبت بہت زیادہ مروج ہو گیا تھا۔ اور جہاں محدثین درسگاہوں میں حدیثیں سنایا کرتے تھے بہت لوگ انکو لکھ لیا کرتے تھے اور جو حافظہ پر پورا

بھروسہ کر سکتے تھے وہ انکو وہیں یاد کر لیا کرتے تھے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے بھی پہلی صدی ہجری کے اختتام کے قریب یہ احکام نافذ کیے تھے کہ احادیث لکھ لی جایا کریں اور علمائے حدیث حدیثوں کی تدریس کے سلسلہ کو وسیع کریں تاکہ جو لوگ علم حدیث سے واقف نہیں وہ بھی واقف ہو جاویں۔ تا اس طرح پر سلسلہ روایت حدیث اور جمع حدیث میں کوئی خلل نہ آوے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس زمانہ میں حدیثیں صرف متفرق طور سے لکھ لی جایا کرتی تھیں وہ کتابوں کی صورت میں نہ تھیں نہ تحریر کے ذریعہ انکی اشاعت ہی ہوتی تھی۔ بہر حال حدیث کا لکھنا عام طور پر مروج ہوگیا تھا اور یہ تیسرے مرحلہ کا اختتام اور چوتھے مرحلہ کا ابتدا تھا۔

دوسری صدی ہجری کے نصف کے قریب حدیث کے لکھے جانے نے ایک اور رنگ پکڑ لیا اور بجائے متفرق مسودات کے جنکی اشاعت بحیثیت ایک کتاب ہونیکے نہ ہو سکتی تھی مستقل کتابیں حدیث پر لکھی جانی شروع ہوگئیں۔ اس زمانہ تک محض تحریری مسودہ اس بات کو ثابت کرنیکیلئے کافی نہ تھا کہ واقعی ایک حدیث صحیح اور قابل اعتبار ہے بلکہ یہ ضروری تھا کہ معتبر سلسلہ رواۃ سے حدیث کو کسی مشہور صحابی تک پہنچایا جائے۔ اور ان تمام راویوں کے نام درجہ بدرجہ ظاہر کیے جاویں جنکے ذریعہ حدیث اس بیان کرنیوالے تک پہنچی تھی۔ اسلیے ان کتابوں میں بھی پورا سلسلہ راویوں کا دیا جاتا تھا مگر کتاب اشاعت کے بعد یہ وقعت رکھتی تھی کہ اسکی احادیث کا حوالہ دیا جاسکے کیونکہ اس زمانے میں تحریر کا رواج عام ہو کر کتابوں کے نسخے کثرت سے شایع ہو سکتے تھے۔ سب سے پہلے جس شخص نے حدیث کی کتاب لکھی وہ امام عبد الملک بن عبد العزیز ابن جریج تھے جو ابن جریج کے نام سے مشہور ہیں اور بعض کے نزدیک سب سے پہلے حدیث کی کتاب ربیع بن صبیح نے لکھی اور تیسری روایت ہے کہ سب سے اول سعید ابن ابی عروبہ تھے۔ یہ تمام محدثین دوسری ہجری کے نصف کے قریب فوت ہوئے جس سے قیاس ہو سکتا ہے کہ حدیث کا کتابوں میں لکھے جانا دوسری صدی ہجری کے نصف سے پہلے شروع ہو چکا تھا۔ انکے بعد حدیث کے بڑے معتبر امام حضرت امام مالک بن انس تھے جنکی کتاب مؤطا آج تک حدیث میں سند مانی گئی ہے۔ یہ کتاب اہل حجاز کی احادیث پر مبنی تھی اور علاوہ احادیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس میں صحابہؓ اور تابعین کے اقوال اور فتاوی بھی درج ہیں۔ مختلف مقامات میں مختلف ائمہ حدیث نے اس زمانہ میں کتابیں لکھیں۔ چنانچہ ابن جریج نے مکہ میں۔ امام مالک نے مدینہ میں۔ سفیان بن عیینہ نے بھی مدینہ میں۔ عبد اللہ بن وہب نے مصر میں۔ معمر اور عبد الرزاق نے یمن میں سفیان الثوری اور محمد بن فضیل نے کوفہ میں۔ حماد بن سلمہ اور روح بن عبادہ نے بصرہ میں ہشیم نے واسط میں۔ اور عبد اللہ بن مبارک نے خراسان میں حدیث پر کتابیں تصنیف کیں۔ ان بڑے بڑے مصنفین کے علاوہ اور لوگوں نے بھی اسوقت تصنیف کا کام شروع کر دیا تھا۔ جیسا کہ امام مالک کے متعلق اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپکے پاس شکایت کی گئی کہ آپ مؤطا کی تصنیف کیلیے اسقدر محنت کیوں اٹھا رہے ہیں جبکہ دوسرے لوگوں نے بھی اسی نام کی کتابیں لکھنی شروع کر دی ہیں

آپ نے فرمایا کہ دنیا عنقریب دیکھ لیگی کہ کس شخص نے محض للہ کام اختیار کیا ہے۔ اب ان تمام مؤطاؤں کا دنیا میں کوئی نشان باقی نہیں سوائے اسکے کہ ابن ابی ذئب کی مؤطا کا ذکر باقی رہ گیا ہے۔ مگر امام مالک کی مؤطا نے دنیا میں وہ عزت اور شہرت حاصل کی ہے کہ آجتک حدیث کی اول درجہ کی مستند کتابوں میں سمجھی گئی ہے۔

یہ تصنیفات جن کا ذکر اوپر ہوا جمع حدیث کا چوتھا مرحلہ ہیں جب اصل میں تدوین حدیث کا کام شروع ہو گیا تھا لیکن ابھی تک یہ کام تکمیل کے درجہ کو نہیں پہنچا تھا۔ چوتھے مرحلہ پر جسقدر تصانیف لکھی گئیں ایک تو انکی اغراض محدود تھے یعنی ان میں ہر قسم کی احادیث نہ پائی جاتی تھیں۔ صرف خاص مقاصد کو مدنظر رکھکر یہ تالیفیں کیگئی تھیں اور دوسرا ان میں وہی احادیث ان مضامین کے متعلق جمع کی گئی تھیں جو اس خاص حصہ ملک میں رائج تھیں مثلاً مؤطا کو ہی لو اس میں صرف اہل حجاز کی احادیث تھیں اور ان میں سے بھی صرف وہ احادیث جو عمل کے متعلق تھیں مثلاً نماز روزہ زکوٰۃ حج وغیرہ کے احکام کے متعلق۔ اور اس قسم کی احادیث جیسے آنحضرت کی سیرت کے متعلق یا مغازی کے متعلق یا تفسیر قرآن کریم کے متعلق وہ اس میں جمع نہیں کی گئیں۔ پس باوجود تدوین کے شروع ہو جانے کے جمع حدیث کا کام ابھی کمال کو نہ پہنچا تھا۔ بلکہ یہ کمال اسے پانچویں مرحلہ پر حاصل ہوا جب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جمع حدیث کا کام شروع کیا۔ اور اسکو ہر پہلو سے مکمل کر کے دکھایا۔ امام محمد بن اسمٰعیل جو بخاری کے نام سے مشہور ہیں کیونکہ بخارا انکا اصل موطن تھا۔ اس وقت کے قریب قریب پیدا ہوئے جو امام مالک کی وفات کا وقت تھا اور جمع حدیث کا شوق آپ کو چھوٹی عمر میں پیدا ہو گیا۔ اور تیسری صدی ہجری کے ابتدا میں یہ کام انہوں نے شروع کر دیا۔ اور کتاب صحیح بخاری تالیف کی۔ آپ کی وفات ۲۵۶ ہجری میں ہوئی یعنی تیسری صدی کے نصف کے قریب۔ ایسا ہی اسی زمانہ کے قریب آپکے شاگرد مسلم نے جمع حدیث کا کام شروع کیا۔ اور صحیح مسلم کو تالیف کیا جس کا مرتبہ صرف صحیح بخاری سے دوسرے درجہ پر ہے۔ پھر ابو داؤد ترمذی اور نسائی نے اسکام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اپنی اپنی مسندیں تالیف کیں۔ یہ تینوں کتابیں اگرچہ موطا۔ صحیح بخاری اور مسلم کے مرتبہ کو نہیں پہنچتیں مگر ان سے دوسرے درجہ پر معتبر کتابیں سمجھی گئی ہیں انکے مصنفوں نے ہر ایک جگہ خود سفر کر کے کل احادیث معتبرہ کو جمع کیا۔ اور اپنی ساری ساری زندگیاں اسی کام کے لیے وقف کر دیں۔ یہ پانچواں مرحلہ جمع حدیث کا تھا جب یہ کام تکمیل کو پہنچ گیا۔ اور معتبر احادیث کا ذخیرہ کتابوں کی صورت میں جمع ہو گیا۔

اس تمام بحث سے یہ امر واضح ہو گیا کہ جمع حدیث کی بنیاد تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ سلم کے وقت میں ہی رکھی گئی تھی مگر اس عمارت کی تکمیل امام بخاریؒ کے ہاتھ سے ہوئی۔ اور اگر حدیث کی اصلیت پر غور کیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ بغیر ان پانچ مرحلوں سے گذرنیکے یہ کام تکمیل پذیر نہ ہو سکتا تھا یہ پانچ مرحلے دراصل پانچ سیڑھیوں کی طرح تھے اور ہر ایک مرحلہ گویا دوسرے مرحلہ کے لیے تیاری کا سامان مہیا کر رہا تھا۔ سب سے اول تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ہے۔ اس زمانے

ہیں اگرچہ بعض صحابہؓ نے خصوصیت سے حفظ حدیث کا کام شروع کردیا تھا مگر بہت سی احادیث ایسی تھیں جن کا علم خاص خاص صحابہؓ کو تھا۔ آپ کی وفات کے بعد یہ موقعہ پیش آیا کہ ایسی تمام احادیث عام اشاعت پاگئیں اور خاص خاص لوگوں نے انہیں محفوظ کرلیا۔ دوسری طرف جن صحابہؓ کو زیادہ حدیثیں یاد تھیں انہوں نے اسی زمانہ میں بذریعہ تدریس یہ احادیث آئندہ نسل کو پہنچانی شروع کیں۔ اور جہاں جہاں صحابہؓ پھیل گئے تھے اسی جگہ تدریس حدیث کے مرکز قائم ہوگئے۔ اسکے بعد تیسرا زمانہ تابعین کا آیا جب حدیث کے علم کا بذریعہ تدریس عام رواج ہوگیا۔ اور مزید براں علاوہ حفظ حدیث کے اسکی یادداشتیں لکھی جانی شروع ہوگئیں۔ اور یادداشتوں کی صورت میں تو کتابوں کی صورت میں حدیث کی تحریر کا رواج عام ہوگیا۔ اور جو لوگ جمع حدیث کے مشتاق تھے وہ ان درسگاہوں میں حاضر ہوکر جب حدیثوں کو سنتے تو ان میں سے اکثر انکو ضبط تحریر میں لے آتے۔ اس تحریر کے رواج سے جمع حدیث کا چوتھا مرحلہ آپہنچا جب بجائے الگ الگ یادداشتوں کے کتاب کی صورت میں ترتیب پاکر حدیثوں کا لکھا جانا شروع ہوگیا۔ پھر اسکے بعد پانچواں مرحلہ آپہنچا جب بجائے ایک خاص مقام سے حدیثیں جمع کرنیکے یا بجائے ایک خاص مضمون پر حدیثیں جمع کرنیکے جامع کتابیں حدیث پر لکھی جانی شروع ہوئیں اسطرح دوسو سال کے عرصہ میں اس عمارت کی تکمیل ہوئی اور جمع حدیث کا کام ختم ہوا۔ لیکن صرف اسوجہ سے کہ اس کام کی تکمیل فی الفور نہیں ہوئی اور ایک دراز عرصہ اس میں خرچ ہوا۔ حدیثوں کی بے اعتباری نہیں کی جاسکتی کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ تک ایک قدرتی ترقی تھی جسکے سوائے یہ کام احسن طور پر سرانجام نہ پاسکتا تھا۔ اور یہ پانچوں مرحلے ایکدوسرے سے ایسے وابستہ ہیں جیسے زنجیر کی کڑیاں۔

چونکہ جمع حدیث کی تکمیل پانچویں مرحلہ پر ہوئی جب جامع کتابیں حدیث پر لکھی گئیں اس لیئے جمع حدیث کا نام خصوصیت سے اس مرحلہ پر بولا جاتا ہے۔ اور دراصل یہ مرحلہ جمع حدیث کا ایسا ہے جو کسی قدر تفصیل سے بحث کی ضرورت رکھتا ہے کیونکہ بعد کے زمانہ میں علم حدیث کی بنا عموماً انہی کتابوں پر رہی ہے جو اس زمانہ میں تالیف ہوئیں اور اس لیئے بھی کہ جامع کتابیں صرف یہی ہیں۔ میور سپرنگر۔ اور اور معترضین نے ان کتابوں میں معتبر احادیث کے ہونے سے انکار کیا ہے اور اسکی وجہ یہ بیان کی ہے کہ ان محدثین نے حدیث کے جمع کرنے میں تنقید کا طریق اختیار نہیں کیا۔ میور سپرنگر کی رائے کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے اور خود اسی رائے کا موید ہے۔ بخاری کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ وہ جن اصول اور قواعد کی پیروی اس نے (یعنی امام بخاری علیہ الرحمۃ نے) کی ان پر تنقید کا نام چسپاں نہیں ہوسکتا۔ وہ صرف یہ دیکھتا تھا کہ راویوں کا سلسلہ پورا ہے یعنی منقطع نہیں ہوجاتا۔ اور ان راویوں کے چال چلن کو دیکھ لیتا تھا۔ اور چونکہ ایک قاعدہ اسنے یہ بھی مقرر کیا ہوا تھا کہ جو حدیث اس کے اپنے متعصبانہ خیالات کے مطابق نہ ہو اسے رد کردیتا تھا۔ اس لیئے اسکے کسی حدیث کو رد کردینے سے یہ نتیجہ کسی صورت میں نہیں نکل سکتا

کہ وہ حدیث واقعی ناقابل اعتبار ہے۔ مگر اسکی جامع دوسری مسندوں سے یہ امتیاز ضرور رکھتی ہے کہ وہ کسی خاص مذہب کا پیرو نہ تھا بلکہ صرف حدیثوں کی فرضی صحت اور راویوں کی راستبازی وغیرہ پر ہی سارا دارومدار رکھا کرتا تھا۔" ایسا ہی میور اپنے دیباچہ لائف آف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں لکھتا ہے "یہ تو ظاہر ہے کہ محدثین کسی قسم کی تنقید کو کام میں لاتے تھے اور وہ بھی ایسی سختی سے کہ بحساب اوسط ہر سو حدیث میں سے انہوں نے قریباً ننانوے کو ناقابل اعتبار ٹھہرایا۔ لیکن یوروپین ناظرین سخت دھوکہ کھائیں گے اگر وہ یہ سمجھ لیں کہ یہ تنقید باوجود اسقدر سختی کے صحیح معنوں میں ایک کامل اور صحیح تحقیقات احادیث کی صحت کے متعلق تھی۔ محدثین کے نزدیک کسی حدیث کے قابل اعتبار ہونیکے لیے اس حدیث کے نفس مضمون کو نہ دیکھا جاتا تھا بلکہ صرف ان ناموں کو دیکھا جاتا تھا جو اس حدیث کے بیان کرنیوالے ہوتے تھے۔ انکے نزدیک صحیح حدیث کی سند پہلے کسی صحابی پر چلنی چاہیئے اور پھر راویوں کے ایک لمبے سلسلے میں ہر ایک راوی کی صداقت پر اس کی بنا ہوتی تھی۔ اگر ان راویوں کی صداقت پر کوئی الزام عائد نہ ہوسکے تو حدیث قبول کرنی چاہیئے۔ نفس مضمون میں کوئی بات خواہ کیسی ہی بعید از قیاس کیوں نہ پائی جاتی ہو۔ وہ ایسی حدیث کے اعتبار کو نہیں گنوا سکتی۔ محدثین بجز تنقید میں کھلی کھلی تشنا وری نہ کرتے تھے۔ بلکہ اس ایک ہی قاعدہ کے غلام ہوگئے تھے۔ اندرونی شہادت پر جرح کرنیکی انکو قطعاً جرأت نہ تھی۔"

یہ دو ایسے شخصوں کی رائے ہے جن کی رائے کو اسلام کے متعلق نہایت محققانہ اور بےلوث مانا گیا ہے۔ مگر میں افسوس سے کہتا ہوں کہ ان خیالات کے ظاہر کرنے میں ان دونوں صاحبوں نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ انکو یہ بھی معلوم نہیں کہ جن احادیث کو محدثین نے وضعی قرار دیا ہے انکو کس بنا پر وضعی قرار دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ محدثین نے راویوں کے متعلق پوری پوری تحقیقات کرنے میں بہت ہی کوشش کی ہے اور میں یہ ثابت کرونگا کہ احادیث کی صحت کو پرکھنے کے لیے اسکی ضرورت تھی مگر یہ بالکل جھوٹ ہے کہ انہوں نے اندرونی شہادت پر مطلق توجہ نہیں کی۔ بلکہ احادیث موضوعہ کے جانچنے کیلیے جو اصول انہوں نے مقرر کیے ہیں وہ قریباً سب کے سب اندرونی شہادت سے ہی متعلق ہیں چنانچہ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے عجالہ نافعہ میں وضعی احادیث کی مفصلہ ذیل علامات بیان کی ہیں۔ جنہیں نواب صدیق حسن خاں نے بھی اپنی کتاب الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ میں ذکر کیا ہے۔ وہ علامات حسب ذیل ہیں۔ اول یہ کہ روایت تاریخ کے خلاف ہو جیسا کہ کہا جائے کہ عبداللہ بن مسعود نے جنگ صفین میں یوں فرمایا حالانکہ حضرت عبداللہ بن مسعود حضرت عثمانؓ کی خلافت میں وفات پاچکے تھے۔ دوئم یہ کہ راوی رافضی ہو اور جو حدیث وہ بیان کرے وہ صحابہؓ کے مطاعن میں ہو۔ یا راوی ناصبی ہو اور اہل بیت کے مطاعن میں حدیث بیان کرے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ پھر اگر راوی اس حدیث کو بیان کرنے میں اکیلا ہو اور اور کوئی راوی اس حدیث کا نہ ہو تو ایسی حدیث منکر ہے اور اگر اور لوگ بھی اس

حدیث کو بیان کرنیوالے ہوں تو حدیث قبول کیجاوے اور اس کی مناسب توجیہ کیجاوے۔ سوئم۔ ایسی حدیث بیان کرے جس کا جاننا اور اسپر عمل کرنا سب مکلفوں پر واجب ہو اور راوی اس حدیث کے بیان کرنے میں اکیلا ہو تو یہ ضبط قرینہ حدیث کے جھوٹا اور موضوع ہونے پر ہے۔ چہارم یہ کہ راوی کا حال اور وہ وقت جب حدیث کو بیان کیا ہے اس کے کذب پر قرینہ ہوں۔ جیسا کہ خلیفہ عباسی مہدی کی مجلس میں غیاث بن میمون کے بیے واقع ہوا کہ جب وہ بادشاہ کے پاس حاضر ہوا تو بادشاہ اسوقت کبوتروں کے اڑانے میں مشغول تھا جسپر غیاث نے بادشاہ کو خوش کرنیکے لیے یہ حدیث سنائی کہ لا سبق الا فی خف او نصل او جناح یعنی کوئی شرط نہیں بدنی چاہیئے مگر اونٹوں (یا گھوڑوں) کی دوڑ میں اور تیر اندازی میں اور جانوروں کے اڑانے میں۔ مگر یہ لفظ جناح (پرندوں کا اڑانا) اصل حدیث میں موجود نہ تھا بلکہ غیاث نے صرف خلیفہ کو خوش کرنیکے لیے اسے بڑھا دیا تھا کیونکہ خلیفہ کو کبوتر اڑانے کا شوق تھا۔ اس قصہ کی تفصیل حیوۃ الحیوان الکبریٰ میں اسطرح پر دی ہے کہ ہارون الرشید کو کبوتروں سے محبت تھی اور انکے ساتھ وہ کھیلا کرتا تھا۔ ایک کبوتر اس کے پاس بطور تحفہ آیا اور اسوقت بادشاہ کے پاس قاضی ابو البختری بیٹھا تھا۔ اور اس نے سند کے ساتھ ایک حدیث ابو ہریرہ سے بیان کی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا سبق الا فی خف او حافر او جناح اور یہ لفظ او جناح کا اپنے پاس سے بڑھا دیا خلیفہ نے اسے کچھ دیکر رخصت کیا اور جب وہ چلا گیا تو کہا کہ خدا کی قسم ہے میں نے خوب سمجھ لیا ہے کہ اس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا کیا ہے۔ پھر حکم دیا کہ کبوتر کو ذبح کر دیا جائے لوگوں نے پوچھا کہ کبوتر کا کیا گناہ ہے کہا اسی کی خاطر اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا باندھا۔ پس اسیوجہ سے اور اس کی اور موضوعات کی وجہ سے محدثین اور علماء نے ابو البختری کی حدیث کو چھوڑ دیا اور کوئی حدیث اس سے نہیں لکھی۔ پنجم یہ کہ حدیث عقل اور شرع کے مقتضی کے مخالف ہو۔ اور قواعد شرعیہ اسکو جھوٹا ٹھہراتے ہوں جیسا کہ قصائے عمری۔ اور حدیث مثل اسکے کہ لا تا کلوا البطیخ حتی تذبحوہ۔ یعنی خربوزہ کو نہ کھاؤ جبتک اسے ذبح نہ کرلو۔ ششم یہ کہ حدیث میں کوئی قصہ کسی ایسے امر محسوس کے متعلق ہو کہ اگر درحقیقت وہ واقع ہوا ہوتا تو لاکھوں انسان اسکو نقل کرتے مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ فلاں خطیب کو جمعہ کے دن ممبر پر قتل کر دیا گیا اور اس کی کھال اتاری گئی اور سوائے اس راوی کے اور کوئی بیان کرنیوالا نہ ہو۔ ہفتم یہ کہ حدیث میں لفظا و معنے رکیک ہوں مثلاً الفاظ ایسے ہوں جو قواعد عربیہ کے مطابق نہیں یا معنے ایسے ہوں جو شان نبوت اور وقار رسالت کے شایان نہیں۔ ہشتم یہ کہ چھوٹے سے گناہ پر سخت وعید میں یا تھوڑے عمل پر بڑے ثواب کے وعدوں میں افراط کا پہلو اختیار کیا گیا ہو۔ جیسے۔ من صلی رکعتین فلہ سبعون الف دار فی کل دار سبعون الف بیت فی کل بیت سبعون الف سریر علی کل سریر سبعون الف جاریۃ یعنی جو شخص دو رکعت نماز پڑھے اسکے لیے بہشت میں

ستر ہزار مکان ہونگے ہر مکان میں ستر ہزار کوٹھے ہوں گے ہر کوٹھے میں ستر ہزار تخت ہونگے ہر تخت پر ستر ہزار لونڈیاں ہونگی۔ بلکہ اس قسم کی کل حدیثیں خواہ وہ ثواب کے بارے میں ہوں اور خواہ عذاب کے موضوع سمجھی گئی ہیں۔ نہم یہ کہ چھوٹے سے عمل پر عمرے اور حج کا ثواب بتایا گیا ہو۔ دہم یہ کہ نیکی کرنیوالے کے لیے کسی انبیاء اور رسلوں کے ثواب کا وعدہ ہو۔ یازدہم یہ کہ خود وضع کرنیوالا اقرار کرے۔ جیسا کہ نوح بن عصمہ کے لیے اتفاق ہوا کہ اس نے قرآن شریف کی ایک ایک سورۃ کی فضیلت میں جھوٹی حدیثیں بنائیں اور انکو رواج دیا اور شہرت دی جیسا کہ یہ بنا دی ہیں ہر ایک سورۃ کے فوائد ان کا ذکر ہے۔ اور جب محدثین نے ان حدیثوں کے متعلق تحقیق شروع کی اور اسے کہا کہ اس کی سند کو صحت کو پہنچائے اور یہ بتائے کہ اس نے یہ حدیثیں کہاں سے لیں تو اس نے اقرار کیا کہ میں نے خود ہی یہ جھوٹی حدیثیں بنائی ہیں۔

اب معترضین اس مقام پر غور کریں کہ ان گیارہ علامتوں میں سے جو وضعی احادیث کے لیے قرار دی گئی ہیں دس علامتیں اندرونی شہادت اور قرائن کے متعلق ہیں۔ حالانکہ میور اور سپرنگر صاحبان جنکو بڑے محقق ہونے کا دعویٰ ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ محدثین کو یہ جرأت ہی نہ تھی کہ وہ قرائن کی شہادت پر یا اندرونی شہادت پر تنقید کریں۔ اس سے بڑھکر ان لوگوں کی جہالت کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے جس آزادی کے ساتھ محدثین نے احادیث پر تنقید کی ہے اسکی نظیر ہمیں دوسری جگہ نہیں ملتی۔ انکے نزدیک دنیوی وجاہت کوئی قابل توجہ چیز نہ تھی بلکہ بڑے سے بڑے آدمی کے چال چلن پر وہ اسی طرح تنقید کرتے جیسے معمولی آدمی پر اور جب انکو ثابت ہو جاتا کہ ایک شخص نے عمداً ایک لفظ بھی جھوٹا حدیث میں ڈالدیا ہے تو خواہ وہ کتنا بڑا آدمی ہوتا مگر اس کی روایت کو وہ ہرگز نہ لیتے۔ اصل بات یہ ہے کہ قرائن کی شہادت اور اندرونی شہادت پر محدثین نے اسی طرح سے تنقید کی جیسے راویوں کے حالات وغیرہ کے متعلق۔ مگر پادری صاحبان کے دل میں اور کانٹا کھٹکتا ہے۔ اب میں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ کیوں محدثین نے راویوں کی جرح اور تعدیل میں اسقدر کوشش کی ہے اور اس سے حدیث کی صحت کے متعلق کیا کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

جاننا چاہیئے کہ محض اندرونی شہادت یا قرائن کی شہادت پر کوئی جرح وارد نہ ہونے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ حدیث واقعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے کیونکہ ہزارہا احادیث ایسی وضع ہو سکتی تھیں اور ہوئیں جن کا مفہوم مخالف عقل نہ تھا۔ مگر محض اس وجہ سے کہ ایک بات مخالف عقل نہیں یہ سند نہیں ملتی کہ وہ بات واقعی صحیح بھی ہے اور اسکے راوی نے سچ بیان کیا ہے۔ کیونکہ ہر ایک جھوٹی بات مخالف عقل نہیں ہوتی بلکہ جن لوگوں کو آجکل عدالتوں میں شہادتوں کے سننے کا اتفاق ہوا ہوگا وہ جانتے ہیں کہ جھوٹی شہادتیں اسقدر احتیاط سے دیجاتی ہیں کہ قرائن اور اندرونی شہادت کی رو سے وہ سچی شہادتوں سے بھی بڑھ جاتی ہیں۔ اور ہزارہا مقدمات کا فیصلہ جج انہی شہادتوں پر

فیصلہ کرتے ہیں۔ اس لیے محدثینؒ نے وہی طریق اختیار کیا جو ہر ایک محقق منتقد کو اختیار کرنا چاہیئے یعنی جب انہوں نے
دیکھا کہ ایک حدیث قرائن اور اندرونی شہادت سے وضعی ثابت نہیں ہوتی تو انہوں نے اتنی بات پر اکتفا کر کے
اسے صحیح نہیں سمجھ لیا اور اپنی کتاب میں داخل نہیں کیا بلکہ پھر بیرونی امر کی تحقیق پر لگا یا کہ وہ لوگ جنکی روایت سے
وہ حدیث ان تک پہنچی ہے کس قسم کے لوگ ہیں آیا وہ ایسے لوگ ہیں جنکی سچائی اور راستبازی اور انکے حافظہ پر
بھروسہ کیا جا سکتا ہے یا انکا جھوٹ بولنا یا اکثر غلطی کرنا وغیرہ امور ثابت ہیں جن سے انکی باتیں بھی قابل اعتبار
نہیں رہ جاتیں۔ جن مراحل کو طے کر کے حدیث صحابہؓ سے اس زمانہ کے محدثین تک پہنچی تھی جب کتابیں لکھی
جانی شروع ہوئیں۔ ان پر نظر کر کے ضروری تھا کہ جامعین حدیث راویوں کے معتبر یا غیر معتبر یا معروف یا مجہول الحال
ہونے پر پوری بحث کرتے اور بغیر اس بحث کے وہ کبھی صحیح نتیجہ تک نہ پہنچ سکتے تھے۔ میں اس سے پہلے مضمون میں
ثابت کر چکا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کے زمانہ میں وضع حدیث کا کوئی نشان ہمیں نہیں ملتا۔
مگر یہ راوی بہت لکھ محدثین پر اس لیے ناراض ہیں اور بخاری اور مسلم جیسے محققین کو اس لیے ناقابل اعتبار ٹھہراتے ہیں کہ
انہوں نے صحابہؓ کو جھوٹی احادیث بنانے سے بری کیوں سمجھا ہے۔ اور اصل میں یہی خار انکے دل میں چبھتا ہے جسکی
وجہ سے وہ بار بار اندرونی شہادت اور قرائن کی شہادت کو پیش کرتے ہیں۔ مگر محدثین کیونکر تاریخ کے خلاف ایک
امر کو صحیح سمجھ سکتے تھے کیونکہ یہ امر واقعہ ہے کہ تابعین سے لیکر جسقدر نسلیں ان محدثین کے زمانہ تک گذریں
ان میں سے ہر ایک نے پورے یقین سے اس بات کو سمجھا ہوا تھا کہ کسی صحابی نے کوئی حدیث وضع نہیں کی۔ اور
حدیث کے پہنچانے میں صحابہؓ کی صداقت پر کبھی کسی قسم کا الزام عاید نہیں ہو سکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سخت
تہدید کا کہ جو شخص جھوٹی حدیث بیان کریگا وہ دوزخی ہوگا اسقدر اثر صحابہؓ کے دلوں پر تھا کہ انکو جب تک کسی حدیث کے
متعلق یقین کامل نہ ہوتا اسے بیان نہ کرتے تھے جمع حدیث کا کام ایک بہت ابتدائی زمانہ میں شروع ہو گیا تھا
اور یہ بالکل ناممکن ہے کہ اگر صحابہؓ میں سے کسی شخص نے حدیث وضع کی ہوتی تو کوئی تذکرہ اسکا نہ پایا جاتا۔ اور ضرور
تھا کہ بعض صحابی ہی اسکا ذکر کرتے کہ فلاں حدیث فلاں صحابی نے وضع کی ہے اس لیے اس سے حدیث نہیں لینی
چاہیئے۔ صحابہؓ کے درمیان جرائم کا کبھی اخفا نہیں ہوتا تھا۔ اور خواہ کوئی صحابی کسی بڑے گناہ کا مرتکب ہو یا چھوٹے
کا اسپر حد تمام کیجاتی تھی۔ اور کبھی کسی شخص کو جرم کی معافی اسوجہ پر نہیں دیگئی کہ وہ صحابی ہے۔ پھر یہ کیونکر ہو سکتا تھا
کہ وضع حدیث کا جرم جس کے مجرم کو کذاب اور جہنمی ٹھہرایا گیا ہے اور جو سب جرموں سے بڑا جرم ہے کیونکہ اس سے
دین میں فتنہ پڑتا ہے ایسے جرم کا اخفا کیا جاتا اور اس کے خطرے سے مسلمانوں کو آگاہ نہ کیا جاتا۔ کیا صحابہؓ اس
خطرے سے آگاہ نہ تھے کہ دین اسلام وضعی احادیث کے مروج ہو جانے سے تباہ ہو جائیگا۔ پھر کیونکر ممکن تھا کہ حدیثیں
انکے سامنے وضع کیجاتی اور وہ نہ صرف ایسے مجرموں کو بے سزا چھوڑتے اور انکے جرم کا اخفا کرتے بلکہ انکے

اس جھوٹ کو اور بھی پھیلاتے پس یہ کسی صورت میں قرین قیاس نہیں کہ اگر وضع حدیث صحابہؓ کے زمانہ میں شروع ہو گیا ہوتا تو کوئی صحابی اسباب کا ذکر نہ کرتا۔ نہ ہی وہ سازش کر کے ایسا کام کر سکتے تھے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی صحابہؓ دور دور پھیل گئے تھے اور پھر آپ کی وفات کے بعد فتوحات کا سلسلہ اسقدر وسیع ہو گیا کہ دور دور ملکوں میں اسلامی جھنڈا گاڑا گیا۔ ان سب کا اس امر پر سازش کر لینا کہ وضعی حدیثیں بنائی جا کر مشتہر کی جاویں اور کوئی شخص بھی نام نہ لے اور آئندہ نسل کو آگاہ نہ کرے کہ یہ حدیثیں وضعی ہیں محال امر ہے۔ ہاں اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت مسیح کی طرح ایک یا دو درجن پیرو پیچھے رہ جاتے اور وہ سب ایک ہی جگہ جمع ہوتے تو ایسی سازش کا کر لینا بھی ممکن تھا کہ فلاں فلاں سچے واقعات کا اخفا کر دیا جائے اور جھوٹے واقعات انکی بجائے مشتہر کیے جاویں مگر آنحضرتؐ کے صحابہؓ تو ایک لاکھ سے بھی زیادہ تھے اور آپکی زندگی میں ہی تمام عرب میں پھیل چکے تھے پس یہ بالکل محال ہے کہ وہ سازش کر کے وضعی احادیث اور جھوٹے قصوں کا اخفا کرتے۔ انکے درمیان بعض فروعی مسائل میں اختلاف بھی تھا۔ مگر کبھی کسی صحابی نے دوسرے صحابی پر وضع کا الزام نہیں لگایا۔ بلکہ ۳۵ہجری میں ہی یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے صرف پچیس سال بعد ملکی تنازعے بھی پیدا ہو گئے تھے مگر ان تنازعوں میں بھی کبھی کسی فریق نے مخالف فریق پر وضع حدیث کا الزام نہیں دیا۔ علاوہ ازیں علم جرح (گواہ کو بے اعتبار ثابت کرنا) اور تعدیل (اسکو صادق اور قابل اعتبار ثابت کرنا) جو علم حدیث کی ایک نہایت ضروری فرع ہے اسکی بنیاد بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں پڑ چکی تھی اور خود آنحضرتؐ نے یہ اجازت دی تھی کہ شہادت کے پرکھنے کے لیے گواہ کے چال چلن کو زیر بحث لایا جا سکتا ہے اور قرآن کریم بھی فرماتا ہے کہ ان جاءکم فاسق بنباء فتبینوا۔ یہ تو صحابہؓ کے زمانہ کا حال تھا اور جب تابعین کے زمانہ کو دیکھتے ہیں تو اس زمانہ میں ہر راوی کے متعلق جرح اور تعدیل کرنیکا رواج عام ہو گیا تھا۔ اور اسی زمانہ میں مشہور محدث اور امام حدیث یحییٰ بن سعید بن قطان اور شعبہ بن حجاج نے اس علم کے متعلق تحقیقات کر کے واقعات کو جمع کیا۔ ان تحقیقات میں جو رجال حدیث کے متعلق کی جاتی تھی کسی شخص کو باہر نہ چھوڑا جاتا تھا۔ بلکہ ہر ایک کی صداقت اور اس کے چال چلن اور اسکی قوت ضبط وغیرہ کو زیر بحث لایا جاتا تھا۔ اور یہ کسی صورت میں ممکن نہیں کہ اگر تابعین کو یا انکے بعد آنیوالی نسلوں کو ایک صحابی کے متعلق بھی کسی حدیث کا وضع کرنا ثابت ہو جاتا تو وہ صحابہؓ پر وہی جرح نہ کرتے جو دوسروں پر انہوں نے کی۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ خود صحابہؓ کو اور پھر انکے بعد ہر ایک نسل کو یہ یقین کامل تھا کہ کسی صحابی نے عمداً کوئی جھوٹی حدیث بنا کر مشہور نہیں کی اور اسی لیے تمام محققین کا اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ صحابی پر جرح کی ضرورت نہیں بلکہ جب ایک حدیث ایک مشہور صحابی تک راویوں کے معتبر سلسلہ سے پہنچ جائے تو پھر اسے صحیح اور قابل اعتبار مان لیا جائے۔ اگر یہ خصوصیت صحابیوں کو نہ ہوتی کہ ان میں کسی نے کوئی حدیث جھوٹی نہیں بنائی تو محدثین انکو

بھی علم الجرح والتعدیل کے نیچے اسی طرح لاتے جس طرح وہ تمام دوسرے راویان حدیث کو لائے۔

اس تمام بحث سے یہ قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی نے کبھی کوئی حدیث وضع نہیں کی۔ پس محدثین صرف انہی حدیثوں کو لیتے تھے جنکی روایت معتبر راویوں کے ذریعہ کسی مشہور صحابی تک پہنچے اور انکا سب سے پہلا فرض یہ تھا کہ وہ دیکھیں کہ آیا جن لوگوں نے اس حدیث کو بیان کیا ہے وہ اعتبار کے قابل گواہ ہیں یا نہیں۔ جن مراحل کو طے کر کے علم حدیث دوسری صدی ہجری کے آخر پہنچ گیا تھا انسے یہ تحقیقات آسان ہوگئی تھی۔ کیونکہ ہر ایک مرحلہ پر جو ائمہ حدیث۔ حدیث کو لینے اور پھر اسے آگے پہنچاتے تھے وہ پچھلے راویوں کو جرح تعدیل کے ماتحت لانیکے بعد اور اس بات کو سمجھکر کہ واقعی یہ حدیث قابل اعتبار ہے اسے قبول کرتے اور آگے پہنچاتے تھے۔ علاوہ ازیں ابتدائی زمانہ تابعین میں ائمہ حدیث جو حدیث کے محافظ اور سکھلانیوالے تھے تھوڑے اور مشہور آدمی تھے اور انکے حالات صدق اور حفظ وغیرہ کے متعلق بھی مشہور رہتے تھے کیونکہ وہ پہلے زیر تنقید آچکے تھے۔ اس لیے محدثین نے جب دوسری صدی ہجری کے اخیر پر حدیث کو کتابوں میں لکھنا شروع کیا تو انہوں نے سب سے پہلی یہ احتیاط کی کہ جس راوی کے حالات معلوم نہیں اس کی حدیث کو قبول نہ کیا جاوے کیونکہ اسکے صدق پر یا حافظہ پر کوئی جرح نہ ہو سکتی تھی۔ ایسے ہی اور بھی کئی ایک قواعد اس علم کے انہوں نے مقرر کیے۔ جن سے راوی کے اعتبار کا اندازہ کیا جاتا۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے کوئی حدیث عمداً وضع کی ہے تو ایسے شخص کی روایت کو بالکل ناقابل اعتبار مانا جاتا۔ ایسا ہی اگر کسی راوی کے متعلق معلوم ہو کہ وہ حدیث کی روایت میں اکثر غلطی کرتا ہے تو اسکا ضبط اور حافظہ ناقابل اعتبار مانے جاتے۔ راوی کی صداقت اور اسکی راستبازی کو خصوصاً بہت باریک نظر سے تحقیق کیا جاتا۔ ایسا ہی یہ بھی دیکھا جاتا کہ آیا ایک شخص جو روایت کرتا ہے اسکا اس شخص سے جس سے وہ روایت کرتا ہے ملنا بھی ممکن تھا یا نہیں۔ بلکہ جن محدثین نے اس سے بھی زیادہ احتیاط کی ہے۔ انہوں نے یہ ضروری سمجھا ہے کہ واقعی ایک کے دوسرے سے ملنے کا ثبوت ہونا چاہیئے اور بغیر اسکے حدیث قبول نہ کی جاویگی۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے اپنی تحقیقات میں اس بات کو ضروری سمجھا ہے۔ ایسا ہی راوی کے حافظہ وغیرہ کے متعلق شہادت لی جاتی۔ ان اصول اور قواعد کے رو سے راوی اور اسکی روایت کو معتبر یا غیر معتبر قرار دیا جاتا تھا۔ اور ہر ایک شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ یہ تحقیق اور تنقید کا پہلو جو محدثین نے اختیار کیا کسقدر مشکل ہے مگر سچ یہی ہے کہ خواہ میور صاحب یا کسی اور پادری صاحب کو اسکی سمجھ آئے یا نہ آئے اس کے بغیر کبھی کسی حدیث کو معتبر یا غیر معتبر قرار نہ دیا جا سکتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ وہ سارے سامان جن کے ذریعے یہ عظیم الشان تحقیق اور تنقید کا کام تکمیل کو پہنچ سکتا تھا پہلے سے موجود تھے کیونکہ جمع حدیث کے ہر مرحلہ پر انہیں تمام اصول اور قواعد سے کام لیا گیا تھا۔ اور جس طرح علم حدیث ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتا رہا اسی طرح اس کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم تنقیدی بھی پہنچتے رہے ہے۔ صحابہؓ اور تابعین کے

زمانہ میں ائمہ حدیث کی تعداد ایسی زیادہ نہ تھی اور انکے حالات بھی مشہور و معروف تھے۔ البتہ بعد کے زمانے میں حدیث کے راویوں اور حدیث کے علم کو پھیلانیوالوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ پس جس قدر ان سب لوگوں کے حالات کا معلوم کرنا مشکل تھا اسیقدر قرب زمانہ کے سبب سے اس میں آسانی بھی ہوگئی تھی۔ علاوہ ازیں ہر زمانہ کے محدثین نے بجائے خود احادیث کو پوری تنقید اور تحقیق کے بعد قبول کیا۔ اور پھر اپنے شاگردوں کو حدیث سکھانے کے علاوہ یہ تنقیدی علوم بھی سکھلائے پس حدیث کے ساتھ ساتھ ہی ہر مرحلہ پر تنقیدی علوم متعلقہ حدیث بھی جمع ہوتے چلے گئے اور میں یہ پہلے لکھ چکا ہوں کہ تابعین کے زمانہ میں بھی علم جرح و تعدیل کے امام پائے جاتے تھے جنہوں نے اس علم کے متعلق واقعات کو تحقیق اور جمع کیا۔ پس اگرچہ ان محدثین کی راہ میں جنہوں نے تیسری صدی ہجری کے شروع میں حدیث کو کتابوں میں لکھنا شروع کیا۔ بہت سی مشکلات تھیں مگر یہ مشکلات ایسی نہ تھیں جنکا حل کرنا محالات سے ہوتا بلکہ انکے حل کرنیکے سامان بھی ساتھ ہی موجود تھے۔

ایک اور اعتراض جو امام بخاری اور دوسرے جامعین حدیث پر عیسائی صاحبان نے کیا ہے یہ ہے کہ جو کتابیں انہوں نے لکھی ہیں ان میں پہلی کتابوں یا پہلے زمانہ کے تحریری مسودوں کا کوئی حوالہ نہیں دیا اور اسطرح پر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان میں سے کونسی احادیث وہ ہیں جو پرانے مسودوں پر مبنی تھیں اور نہ یہ پتہ لگتا ہے کہ آیا کتابوں میں ان پرانے مسودات کی مدد سے کوئی فائدہ بھی اٹھایا گیا ہے یا نہیں۔ اعتراض کے حصہ اول کا جواب تو گذشتہ مضمون میں دیا جا چکا ہے۔ اعتراض کے حصہ دوم کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جمع حدیث کا ہر مرحلہ اس سے پہلے مرحلہ پر مبنی ہے۔ اور یہ گمان نہیں کرنا چاہیئے کہ تیسری صدی ہجری کے محدثین نے اپنی تحقیق سے کوئی اور حدیثیں صحیح ثابت کی تھیں بلکہ ان محدثین کی غرض تو صرف یہی تھی کہ ان احادیث کو الگ کرکے دکھا دیں جو ابتدا سے نسلاً بعد نسل چلی آئی ہیں اور ان احادیث کو الگ کر دیں جو پیچھے لوگوں نے مختلف اغراض سے وضع کرلی تھیں۔ اسلیے انہوں نے پہلے لوگوں کی محنت کو جو صحیح حدیث کے سکھانے اور انکے انتظام کرنے میں انہوں نے کی ناقابل التفات نہیں سمجھا بلکہ انہی کی محنت سے فائدہ اٹھایا تحریری شہادت کو انہوں نے معتبر زبانی سلسلہ روایت کے لیے مددگار تسلیم کیا لیکن صرف مسودات کو جب تک انکے ساتھ زبانی شہادت نہ ہو نہ ان محدثین نے اور نہ ان سے پہلوں نے کبھی قطعی ثبوت صحت حدیث کا تسلیم نہیں کیا۔ اور یہ بات ایسی ہے جسکا اقرار خود میور اور سپرنگر نے بھی کیا ہے کیونکہ وہ لکھتے ہیں کہ "حدیث کے ہر مرحلہ پر بغیر زبانی شہادت کے مطلق کوئی روک جعلسازی اور احادیث میں نئی باتیں داخل کرنیکے خلاف نہ ہوتی"۔ (دیکھو سپرنگر کا مضمون جسکا خلاصہ میور نے اپنی کتاب اسلامی مناظرہ میں دیا ہے اور خود اسکی تائید کی ہے)۔ پس جب یہ صورت تھی تو پھر یہ مطالبہ کرنا کہ محدثین نے کیوں مسودات کے حوالے نہیں دیے محض حماقت ہے۔ کیوں کہ کسی مرحلہ پر زبانی شہادت کے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا اور صاحب تصنیف محدثین کا کام یہ تھا کہ وہ احادیث کو ایک ایک مرحلہ طے کرا کر انکو صحابہ رضی اللہ عنہم تک پہنچائیں خواہ وہ اپنا اطمینان مسودوں سے کریں یا کسی اور طرح مگر اسطرح جمع کی ہوئی احادیث کو اس قابل بنانے کے لیے کہ وہ پھر بھی

تنقید کے نیچے آسکیں محدثین کا یہ فرض تھا کہ وہ سلسلہ رواۃ کا پورا ذکر کرتے کیونکہ مدار صحت آخر راویوں کے سلسلے پر تھا نہ مسودوں پر جو ہزار ہا جعلی بن سکتے تھے۔ پس ان حالات کے ماتحت محدثین نے حدیث پر کتابیں تصنیف کرتے وقت جو راستہ اختیار کیا وہ ایسا راستہ تھا جو بڑے سے بڑا محقق اختیار کر سکتا تھا۔ بکھرے ہوئے مسودات کی تحریری شہادت پر نہ تو پورا اعتبار رہ ہی ہو سکتا تھا اور نہ ہی یہ سلسلہ بغیر ٹوٹنے کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ تک پہنچایا جا سکتا تھا۔

ایک اور اعتراض جو میور نے کیا ہے یہ ہے کہ محدثین کو ایک دوسرے کی تحقیق پر کوئی اعتبار نہ تھا کیونکہ ہر ایک محدث نے اپنے اپنے طریق سے تخریج احادیث کی ہے گویا اپنے سے پہلے محدث کی تحقیق کو اس نے درست نہیں سمجھا۔ عیب نمائد ہنرش در نظر دالا معاملہ ہے۔ ان لوگوں نے اسلام پر اعتراض کرنے کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے اور نہیں سوچتے کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ جہاں تک ہم دیکھتے ہیں ہر محدث کی آزادانہ تحقیقات صحت احادیث پر ایک کھلا کھلا گواہ ہے۔ مگر پادری صاحبان کے نزدیک یہی اعتراض ہے۔ اگر محدثین آزادانہ تحقیقات الگ نہ کرتے تو پھر یہی لوگ کہتے کہ ایک شخص نے جو حدیثیں جمع کر دیں سب نے اسی کا تتبع کیا اسلیے یہ احادیث قابل اعتبار ہی نہیں کیونکہ صرف ایک شخص کی رائے کی پیروی سب نے کی ہے۔ اور اس سے پادری صاحبان کو یہ کہنے کا موقع بھی ملتا کہ اسلام میں آزادانہ تحقیقات کی روح ہی نہیں ہے۔ لیکن جب ایسی تحقیق کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ الگ الگ راہوں پر چلکر کل محدثین ایک ہی نتیجہ پر پہنچے تو اب پادری صاحبان کہتے ہیں کہ محدثین کو ایک دوسرے کی صداقت کا اعتبار نہ تھا۔ میں کہتا ہوں کہ محدثین کے اس طریق سے ہمیں صحت حدیث پر بڑی بھاری دلیل ملتی ہے کیونکہ جو کچھ اختلاف یا ہمی اعلیٰ طبقہ کے محدثین میں ہیں وہ بمقابلہ متفقہ احادیث کے کچھ بھی نہیں۔ پس اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ واقعی یہ احادیث سچے قابل اعتبار ہیں۔ اور کم از کم یہ کہ جن احادیث پر دو دو تین تین چار چار محدثین کا اتفاق ہو گیا ہے انکی صحت میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ مختلف زمانوں میں مختلف ممالک میں مختلف آدمیوں کا اپنے اپنے طور پر تحقیقات کر کے سب کا ایک ہی بات پر متفق ہو جانا اس بات کی صحت پر ایک بڑی بھاری شہادت ہے۔ مثلاً جو کتابیں دوسری صدی ہجری کے نصف میں لکھی گئیں اور جو تیسری صدی ہجری میں لکھی گئیں وہ بھی ایک دوسرے کی تائید ہی کرتی ہیں۔ اور سوائے اس کے کہ پچھلی کتابیں جامع ہیں اور کوئی اختلاف ایسا نظر نہیں آتا جس سے احادیث کے قابل اعتبار ہونے پر کوئی شبہ پڑ سکے۔ بلکہ تمام بڑی بڑی باتوں اور اہم امور میں ان سب کا اتفاق ہے۔

اب جب ہم اختلافات پر غور کرتے ہیں تو ان میں کوئی ایسی بات نہیں پاتے جس سے حدیثوں کی صحت پر شبہ وارد ہو سکے بلکہ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایسے اختلاف ہوتے اور ان اختلافوں کا ہونا در اصل احادیث کی صحت پر بھی شہادت ہے۔ مثلاً اول تو فروع میں مذہب اسلام نے ایسی سختی نہیں کی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان میں بھی اختلافات فروع میں پائے جاتے ہیں جس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض فعلوں کو

کبھی تصحیح کر کے دکھایا یا بعض امور میں خود ہی رخصت دی اسکی شہادت کثرت سے احادیث سے ملتی ہے بلکہ جب امام مالک رح موطا لکھ چکے تو خلیفہ ہارون الرشید نے آپ سے یہ مشورہ کیا کہ موطا کو کعبہ میں لٹکا دیا جاوے اور لوگوں کو یہ حکم دیا جاوے کہ وہ سب اسی پر عمل کریں جو موطا میں لکھا گیا ہے تو امام مالک رح نے فرمایا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے کیونکہ فروع میں تو صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی اختلاف تھا اور وہ دور دور ملکوں میں پھیل چکے تھے۔ جس سے یہ معلوم ہوا کہ بعض اختلاف جائز ہیں اور ان اختلافوں کے ہونے سے کسی حدیث کی صحت پر شک نہیں پڑ سکتا۔ ایسا ہی جب خلیفہ منصور نے امام مالک رح سے کہا کہ موطا کے نسخے سب شہروں میں بھیج دیئے جاویں اور کل لوگوں کو تاکید کیجاوے کہ وہ اسپر عمل کریں تو یہی جواب اسوقت بھی آپ نے دیا۔ دوسری قسم کے فرق وہ ہیں جو اسوجہ سے اختلاف معلوم ہوتے ہیں کہ یا تو مثلاً دو تصنیفوں کا دائرہ ایک سا ہی وسیع نہیں مثال کے طور پر موطا اور صحیح بخاری کو لو صحت کے لحاظ سے یہ دونوں سب سے اعلیٰ طبقہ حدیث کی کتابیں ہیں مگر موطا میں صرف تین سو کے قریب حدیثیں ہیں اور صحیح بخاری میں اڑھائی ہزار سے کچھ اوپر ہیں۔ اب اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ امام مالک رح نے صرف اہل حجاز کی حدیثیں لیں لیکن امام بخاری رح نے بلاد و امصار میں پھر کر ہر جگہ سے حدیثیں جمع کیں۔ اور ایسا ہی امام مالک رح نے ہر قسم کی حدیثیں جمع نہیں کیں اور امام بخاری رح نے ہر قسم کی حدیثیں جمع کیں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم اور ابوداؤد کی حدیثوں میں بھی ایک قسم کا فرق پایا جاتا ہے جسکی وجہ وہ قوانین تنقید ہیں جو ہر ایک نے الگ الگ اختیار کیے مثلاً مسلم کے نزدیک یہ کافی ہے کہ جو راوی حدیث بیان کرتا ہے اس کے متعلق یہ ثابت ہو کہ جس سے وہ حدیث بیان کرتا ہے یعنی اسکا شیخ وہ اسکا ہمعصر ہے۔ مگر بخاری کے نزدیک اسقدر پر اکتفا کرنا ٹھیک نہ تھا بلکہ انہوں نے جس قانون تنقید کے رو سے حدیثوں کو قبول کیا ہے وہ یہ ہے کہ راوی کا اپنے شیخ سے ملاقات کرنا ثابت ہو۔ اسطرح پر بخاری کے قوانین تنقید دوسرے تمام محدثین کی نسبت سخت تر تھے اور انکی پابندی سے حدیث کو جمع کرنا بہت ہی مشکل کام تھا۔ مگر چونکہ جس طریق پر امام بخاری رح حدیثوں کو پرکھتے تھے وہ بہت محتاط طریق تھا اس لیے بخاری کی حدیثیں بھی صحت کی رو سے افضل ہیں اگرچہ تعداد میں کم ہیں۔ مثلاً وہ حدیث جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی کا نقش تین سطروں میں تھا۔ محمد ایک سطر میں۔ رسول ایک سطر میں اور اللہ ایک سطر میں یہ حدیث صرف بخاری میں پائی جاتی ہے اور دوسرے کبار محدثین نے اسے نہیں لیا۔ مگر اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خط کے دریافت ہونے سے اس حدیث کی صحت ثابت ہو گئی۔ اسی طرح پر بخاری کی احادیث کی صحت دوسری تمام کتابوں سے بڑھی ہوئی ہے اور جو عام اعتقاد امت محمدیہ کا اس کتاب کے متعلق ہے کہ یہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے وہ بالکل درست ہے۔ ایسا ہی صحیح مسلم۔ ابوداؤد اور ترمذی نسائی وغیرہ سے فضیلت رکھتی ہے کیونکہ جہاں بخاری اور مسلم صرف ان احادیث کی تخریج کرتے ہیں جنکے راویوں کے قابل اعتبار ہونے پر پہلے محدثین کا

اتفاق رہا ہو۔ نسائی نے ان حدیثوں کو بھی لے لیا ہے جنکے راویوں کے قابل اعتبار ہونے پر اگرچہ اتفاق نہیں مگر انکے ناقابل اعتبار ہونے پر بھی اتفاق نہیں یعنی کسی نے ان راویوں کو ثقہ مانا ہے اور کسی نے غیر ثقہ۔ ایسا ہی ابوداؤد نے ان ابواب میں لے لیا ہے۔ پس ان مختلف قواعد تنقید کی پیروی سے یہ ضروری تھا کہ بعض حدیثیں جو ایک محدث نے قبول کرلی ہیں دوسرا انہیں قبول نہ کرتا۔ اب ان اختلافات کو چھوڑ کر جنکا ذکر اوپر ہوا۔ یعنی وہ اختلافات جو فروعی مسائل میں پائے جاتے ہیں اور جن کا ہونا صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی ثابت ہے۔ اور وہ فرق جو بہ سبب تنگی یا وسعت دائرہ تحقیق کے پیدا ہوئے۔ اور وہ فرق جو بہ سبب قواعد تنقید میں سختی یا نرمی کے پیدا ہوئے۔ ان اختلافات کو جو در اصل حدیث کی صحت پر انسے کوئی شبہ وارد نہیں ہوتا الگ چھوڑ کر باقی جو اختلاف رہ جاتے ہیں وہ برائے نام اختلاف ہیں اور اسطرح پر مختلف محدثین کی اپنی اپنی آزادانہ تحقیقات کا نتیجہ حدیث کا ایک عظیم الشان مجموعہ ہے جس کی صحت میں ایک محقق کو کسی قسم کا شک نہیں ہو سکتا۔

ایک اور اعتراض جو جمع حدیث کے متعلق پادری صاحبان کرتے ہیں یہ ہے کہ محدثین نے طرح طرح کے اثروں سے متاثر ہو کر احادیث کو جمع کیا ہے اور اس لیے انکی احادیث چنداں قابل اعتبار نہیں۔ یہ اثر دو قسم کے بتائے جاتے ہیں ایک ان بادشاہوں کا اثر جن کی حکومت میں جمع حدیث کا کام ہوا۔ اور دوسرا محدثین کے اپنے عقائد اور دل میں جمے ہوئے خیالات کا اثر۔ یہ دونوں اعتراض بھی ایسے ہی لغو ہیں جیسے کہ وہ اعتراض جن کا بیان اوپر ہو چکا ہے۔ میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ کسی خوشامدی نے کسی بادشاہ کے خوش کرنیکے لیے حدیثیں وضع کی ہوں مگر یہ کہنا کہ بخاری اور مسلم جیسے محدثین نے احادیث کو جمع کرتے وقت بادشاہ وقت کا لحاظ کیا اور مضبوط اور صحیح احادیث کو جو بادشاہ کے فوائد کے منافی تھیں رد کر دیا اور احادیث کو جنسے اس کے فوائد کی تائید ہوتی تھی قبول کرلیا۔ ان راستباز محققین پر سراسر افترا ہے۔ جن محققین نے احادیث کو جمع کیا انکو قطعاً حکومت کی کوئی پرواہ نہ تھی اور نہ حکومت کے اثر سے ایسے متاثر تھے کہ ایسا بے ایمانی کا کام کرتے۔ نہ وہ بادشاہوں کے درباروں میں جانیوالے تھے اور نہ ان کو یہ خیال تھا کہ ہمارے کسی منصب یا عزت میں فرق آجائیگا۔ وہ صرف اسی عزت کے خواہاں تھے جو خدا کے ہاں سے سچے متقی کو ملتی ہے۔ جب بخارا کے حاکم نے امام بخاری علیہ الرحمۃ سے یہ خواست کی کہ آپ اس کے لڑکوں کو شاہی محل میں آکر پڑھایا کریں تو آپنے جواب دیا کہ میں علم فروشی نہیں کرتا پھر جب اس نے کہا کہ آپ اپنے مکان پر ہی پڑھائیں لیکن دوسرے لوگوں سے الگ کر کے پڑھائیں تو آپنے یہ بھی نامنظور کیا اور فرمایا کہ اگر آپ انکو پڑھانا چاہتے ہیں تو جہاں عام لوگ بیٹھتے ہیں وہیں یہ بھی آجایا کریں۔ چنانچہ آپنے جلاوطنی قبول کی مگر اس بات کو قبول نہ کیا کہ علم کو شاہی اثر کے نیچے آنے دیں یا بادشاہی کو علم کے مقابلہ پر کوئی عزت دیں۔ ایسی ہی اور بھی مثالیں موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ محدثین کو بادشاہوں کی ہرگز پرواہ نہ تھی اور حدیث کے جمع کرنے میں وہ صرف انہی قواعد تنقید کے پابند تھے جنکو انہوں نے ضروری سمجھا بلکہ ایک مشہور شاہی قاضی کے متعلق جب انہیں معلوم ہوا کہ اس نے بادشاہ کے خوش کرنیکے لیے ایک حدیث میں ایک لفظ بڑھا دیا تو

بعض

اس کی حدیث کو انہوں نے مطلقاً چھوڑ دیا۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ محدثین نے خاص خاص خیالات کے اثر کے نیچے حدیث کو جمع کیا جیسا کہ امام بخاری علیہ الرحمۃ کے متعلق لکھا ہے کہ جب کسی حدیث کو وہ اپنے متعصبانہ خیالات کے خلاف پاتے تھے تو اسے فوراً رد کر دیتے تھے اور یہ وجہ دی ہے کہ ان کی کتاب قابل اعتبار نہیں۔ یہ بھی جھوٹ ہے۔ جہانتک ہم دیکھتے ہیں محدثین صرف اپنے قواعد تنقید کے پابند تھے اور جب انکو ان قواعد کے روسے ایک حدیث صحیح ملجاتی تھی تو وہ اسکو کسی صورت نہیں چھوڑتے تھے۔ اگر وہ اس طرح سے خیالات سے متاثر ہونیوالے ہوتے تو جس طرح آزادانہ تحقیقاتیں انہوں نے کی ہیں ہرگز نہ کرسکتے اعتراض کر دینا تو چنداں مشکل نہیں مگر اس کے ثبوت کے لیے ضرورت ہے کہ پادری صاحبان یہ دکھاویں کہ فلاں فلاں حدیثیں جو فلاں محدث کو اپنے اصول تنقید کی روسے صحیح ثابت ہوئی تھیں اس نے ایسے ایسے خیالات سے متاثر ہوکر چھوڑ دیں اور انکو اپنی کتاب میں درج نہ کیا۔ جو خیالات صحابہؓ کی عزت کے انکے دلوں میں متمکن تھے انسے بڑھکر اور کوئی خیالات انکو متاثر کرنیوالے نہ ہوسکتے تھے مگر منجملہ ان قواعد تنقید کے جنپر وہ چلتے تھے انہوں نے یہ قاعدہ رکھا ہوا تھا کہ اگر ایک رافضی بھی مطاعن صحابہؓ میں حدیث بیان کرے اور اُس حدیث کی تائید اور طرح سے بھی ہوتی ہو تو اسے قبول کر لینا چاہیئے اور اسکی توجیہ کرنی چاہیئے ایسا ہی ناصبی کی حدیث انہیں شرائط پر مطاعن اہل بیت میں قبول کر لی جاتی تھی۔ اور جو احادیث بخاری یا مسلم یا دیگر اکابر محدثین نے جمع کی ہیں ان میں سے سیکڑوں نظیریں ایسی پیش کی جاسکتی ہیں کہ محدثین صرف اپنے اصول تنقید کے پابند تھے۔

باوجودیکہ میور محدثین کے اصول تنقید کو بالکل بے حقیقت ظاہر کرتا ہے مگر ساتھ ہی وہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ اسقدر سخت تھے کہ ایک سو میں سے ننانوے حدیثوں کو انہی قواعد کے روسے وہ قبول نہیں کرسکے۔ اب میں یہ پوچھتا ہوں کہ اگر ان اصول کے روسے جنپر پادری صاحبان کے نزدیک اصول تنقید کا نام چسپان نہیں ہوسکتا صرف سو میں سے ایک حدیث قبول کی گئی تو پھر انکے فرضی اصول تنقید کے روسے تو لاکھ میں سے ایک حدیث بھی قابل اعتبار نہیں ہونی چاہیئے۔ دوسری طرف یہ تعجب آتا ہے کہ انکے یہ خیالی قواعد تنقید جنکے بغیر یورپین دل اور دماغ خوش نہیں ہوسکتا اُسوقت کہاں رکھے رہ جاتے ہیں جب اناجیل کے بے سروپا قصوں کو وہ صحیح تاریخ سے بھی بڑھکر کچھ رتبہ دیتے ہیں حالانکہ ایشیائی قواعد تنقید سے پرکھا جانے پر بھی وہ اسطرح پاش پاش ہو جاتے ہیں جس طرح نور کے سامنے ظلمت۔ مگر احادیث کے متعلق میور خود اقراری ہے کہ "دوسری صدی ہجری میں حدیث میں اکثر حصہ صداقت کا پایا جاتا ہے" تو پھر اگر وہ اکثر حصہ صداقت کا محدثین کی جمع کردہ احادیث میں نہیں تو کیا ان احادیث میں ہے جن کو محدثین نے ناقابل اعتبار سمجھکر رد کر دیا ہے؟ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مخالف خواہ کیسا ہی مخالفت پر تُلا ہوا ہو اسقدر حماقت کا دعویٰ کریگا۔ محدثین نے تاریخی طور پر احادیث کی صداقت کو ثابت کیا ہے۔ انسے غلطی کا ہو جانا بھی ممکن ہے مگر اتنی بات سے وہ تاریخ کی

حیثیت سے گر نہیں سکتیں کیونکہ کسی تاریخ کے متعلق خواہ وہ ان واقعات کے زمانے میں ہی لکھ لی گئی ہو جب ان کا ظہور ہو مگر تاہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ غلطی کی آمیزش سے بالکل پاک ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک حدیث جسے کہ محدثین نے ناقابل اعتبار سمجھکر رد کر دیا ہو در اصل صحیح ہو مگر اس کی صحت کا ثبوت اور طرح سے ملنا چاہیئے۔ ایسے امکانوں کی بنا پر کوئی سمجھدار آدمی یہ طریق اختیار نہیں کیا کرتا کہ ہر ایک معتبر اور مستند واقعہ کو فرضی سمجھ لے اور جھوٹے مضمون کو صحیح سمجھ لے۔ بلکہ جہاں اس قدر تحقیق سے ایک کام کیا گیا ہے اس میں اگر کوئی غلطی ہے تو اس کے لیے دلایل پیش کرنے چاہئیں۔ اور اگر کوئی صحیح امر اس سے باہر چھوڑ دیا گیا ہے تو اس کی صحت کا ثبوت دینا چاہیئے۔ محدثین نے ہر طرح سے اور پوری پوری نیک نیتی سے اپنی تحقیقات کی ہے اور جن نتائج پر وہ پہنچے ہیں انکو آج ہم یہ بات کہکر رد نہیں کر سکتے کہ ممکن ہے انہوں نے کوئی غلطی کی ہو۔

تمام حدیث کے مجموعوں میں امام بخاری علیہ الرحمۃ کی کتاب فوقیت رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ کل امت محمدیہ کا اس بات پر اتفاق ہو گیا ہے کہ وہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ زمانے کے لحاظ سے بھی یہ کتاب جمع حدیث کے تکمیل کو پہنچانے میں سب پر مقدم ہے۔ اور اپنی خوبیوں کے لحاظ سے بھی سب پر فضیلت رکھتی ہے۔ اس کو یہ عزت اور شہرت بعد کے زمانے میں ہی حاصل نہیں ہوئی بلکہ امام بخاریؒ کے تمام ہمعصر امام بخاریؒ اور آپ کی اس تصنیف کی فضیلت کے سامنے سر جھکاتے تھے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ آپ نے احادیث کے لینے میں بہت ہی احتیاط کی تھی۔ مثلاً صحت حدیث کے لیے عام شرط تو صرف اسی قدر تھی کہ راوی مسلم ہو صادق ہو مدلس (یعنی ایک روایت کو دھوکہ دیکر دوسرے کی بیان کرنیوالا) نہ ہو۔ مختلط نہ ہو۔ صفات عدالت سے متصف ہو ضابط اور متحفظ ہو۔ سلیم الذہن ہو قلیل الوہم ہو سلیم الاعتقاد ہو۔ لیکن ان سب احتیاطوں کے علاوہ امام بخاریؒ اور بھی کئی طرح کی احتیاطوں سے کام لیتے تھے اگر ایک محدث مثلاً زہری کے شاگردوں کو پانچ طبقوں پر تقسیم کیا جائے تو وہ عموماً صرف سب سے اعلیٰ طبقہ کی روایت کو لیتے یعنی وہ طبقہ شاگردوں کا جس کے متعلق یہ ثابت ہو کہ زہری کی صحبت میں وہ اکثر رہے ہیں اور سفر و حضر میں انہوں نے انکا ساتھ نہیں چھوڑا جیسے یونس بن یزید۔ عقیل بن خالد۔ مالک بن انس۔ سفیان بن عیینہ۔ شعیب بن ابی حمزہ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایسے راویوں میں غلطی کا احتمال بہت ہی کم رہ جاتا تھا کیونکہ اکثر ساتھ رہنے سے بار بار احادیث کو وہ سنتے تھے۔ اب اگرچہ زہری کے راویوں کا دوسرا طبقہ بھی بلحاظ حفظ و اتقان وغیرہ کے قابل اعتماد ہے لیکن خصوصیت جو طبقہ اول کو حاصل تھی دوسرے طبقہ کو حاصل نہ تھی۔ اس لیے امام بخاریؒ نے طبقہ اول کی ہی روایت لی ہے جو سب سے معتبر طبقہ تھا۔ ایسا ہی امام بخاریؒ نے دوسرے محدثین کی طرح صرف اسقدر ثبوت پر اکتفا نہیں کیا کہ راوی اپنے شیخ کا ہمعصر ہو بلکہ جب تک راوی کا اپنے شیخ سے ملاقات کا ثبوت نہ ملے اسوقت تک وہ اسکی حدیث کو قبول نہ کرتے تھے۔

امام بخاری علیہ الرحمۃ کی عمر صرف دس سال کی تھی جب آپ نے حدیث کو حفظ کرنا شروع کیا۔ اور ایک ہی سال میں اسقدر وسیع علم آپ کا ہو گیا تھا کہ ایک بڑے محدث کی غلطی کی اصلاح آپ نے مجلس میں کی۔ سولہ سال کی عمر میں ابن المبارک

اور وکیع کی کتابیں آپ کو حفظ تھیں۔ اُسی سال آپ حج کو گئے اور اٹھارہ سال کی عمر میں کتاب قضایا الصحابۃ والتابعین لکھی اس کے بعد مدینہ میں آپ نے تاریخ لکھی۔ جو چاندنی راتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک کے پاس لکھی گئی۔ آپ شام اور مصر اور جزیرہ میں دو دفعہ گئے اور بصرہ میں چار مرتبہ۔ حجاز میں آپ چھ سال رہے اور کوفہ اور بغداد میں محدثین کے ساتھ بہت دفعہ ملتے رہے۔ رحاشد کہتے ہیں کہ بخاری ہمارے ساتھ مشائخ بصرہ کی مجلس میں جایا کرتے تھے اور وہ ابھی لڑکے تھے لیکن وہ لکھتے کچھ نہ تھے یہاں تک کہ کئی دن اسی طرح گذر گئے تب سولہ[16] دن کے بعد ہم نے انکو ملامت کی تب انہوں نے کہا کہ تم مجھ پر بہت اعتراض کرتے ہو تم اپنی اپنی تحریریں لاکر بتاؤ کہ تم نے کیا کیا لکھا ہے ہم نے اپنے اپنے مسودے سنائے جس پر بخاری نے پندرہ ہزار سے زیادہ حدیث صرف زبانی یادداشت سے سنائی۔ یہاں تک کہ ہم اپنے مسودے انکے حافظہ سے مقابلہ کرکے درست کیا کرتے تھے۔ ابوبکر بن ابی عیاش الاعین کہتے ہیں کہ ہم محمد بن یوسف فریابی کے دروازے پر محمد ابن اسمٰعیل سے حدیث لکھا کرتے تھے اور ابھی وہ امرد یعنی بے ریش نوجوان تھے۔ آپ علم حدیث کے تمام فروع کے ماہر تھے۔ ابو عیسیٰ ترمذی کہتے ہیں کہ علم علل و اسانید میں محمد بن اسمٰعیل بخاری سے زیادہ ماہر میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ امام مسلمؒ نے آپ کو کہا کہ آپ کی مانند دنیا میں کوئی شخص نہیں۔ سلیم بن مجاہد کہتے ہیں کہ مجھے محمد بن اسمٰعیل نے کہا کہ میں نے صحابہؓ اور تابعین سے جسقدر حدیثیں روایت کی ہیں ان میں سے اکثر کے مولد اور وفات اور جائے سکون کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ جب امام بخاریؒ بغداد میں تشریف لائے۔ اور اصحاب حدیث نے انکی آنیکا چرچا سنا تو سب جمع ہوئے اور انکے حافظہ کا امتحان لینے کا ارادہ کیا پس انہوں نے ایک سو حدیث چُنی اور انکے متنوں اور سندوں کو ملا جُلا دیا یعنی ایک حدیث کی متن کو دوسری کی سند کے ساتھ اور ایک کی سند کو دوسری کے متن کے ساتھ۔ پھر ان حدیثوں کو دس آدمیوں میں برابر تقسیم کر دیا۔ اور انکو کہا کہ جب بخاری کے پاس جائیں تو یہ حدیثیں اس کے سامنے پیش کریں پھر انہوں نے بخاری سے ایک عام مجلس کرنیکا وعدہ لیا اور بہت سے لوگ انکے علاوہ خراسانی اور بغدادی اس مجلس میں حاضر ہوئے جب مجلس قایم ہو گئی تو اُن دس آدمیوں میں سے ایک شخص اُٹھا اور اس نے اُن حدیثوں میں سے ایک حدیث پڑھی۔ بخاری نے کہا میں اس حدیث کو نہیں جانتا۔ پھر اس نے دوسری حدیث پڑھی اور بخاریؒ نے وہی لفظ پھر کہے جو پہلے کہے تھے۔ اسی طرح پر اس کی دس حدیثیں ختم ہو گئیں تو دوسرے شخص نے اپنی دس حدیثوں کو ایک ایک کرکے سنایا اور امام بخاریؒ نے وہی جواب دیا۔ اسی طرح پر جب کل سو حدیث ختم ہو گئی تو پھر امام بخاریؒ سب سے پہلے آدمی کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ جو حدیث تو نے سب سے پہلے بیان کی تھی وہ اس طرح پر ہے اور متن اور سند کو درست کرکے بیان کیا۔ پھر دوسری حدیث کو اسی طرح درست کرکے بیان کیا اور جب پہلے آدمی کی ساری حدیثیں ختم ہو گئیں تو دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر اس کی حدیثوں ایک ایک کرکے درست کیا اور اسی طرح

دس کے دس آدمیوں کو انکی احادیث صحیح کر کے سنادیں اس پر سب نے آپکے حافظہ کی عجیب قوت کا اقرار کیا اور آپ کی فضیلت کا اعتراف کیا - ایسا ہی بیان کیا جاتا ہے کہ سمرقند میں چار سو محدث تھے انہوں نے بھی امتحاناً بخاریؒ کو مغالطہ دینا چاہا اور اسناد شام کو اسناد عراق میں داخل کر دیا اور اسناد عراق کو اسناد شام میں اور اسناد حرم کو اسناد یمن میں داخل کر دیا مگر امام بخاریؒ اس امتحان میں بھی پورے کامیاب نکلے اور کسی قسم کی غلطی آپ سے سرزد نہ ہوئی۔

امام بخاری علیہ الرحمۃ نہ صرف علم و فضیلت کے لحاظ سے ہی ایک عظیم الشان انسان تھے بلکہ ان کے قواعد تنقید بھی بہت سخت تھے - چنانچہ وہ خود کہتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کی دس ہزار حدیثوں کو چھوڑ دیا کیونکہ مجھے اسکی صداقت پر شبہ ہو گیا تھا - اگرچہ پادری صاحبان مسلمان محدثین کے اصول تنقید پر اپنا اطمینان ظاہر نہیں کرتے مگر یہ یقینی امر ہے کہ اگر کبھی بخاری جیسا ایک انسان عیسائی مذہب میں پیدا ہوتا تو پولوس جیسے آدمی کی شہادت کو وہ ہرگز قبول نہ کرتا کیونکہ پولوس وہ شخص ہے جس نے صریح طور پر عیسائی مذہب کے پھیلانے کے لیے جھوٹ کا بولنا جائز رکھا - جیسا کہ وہ رومیون ۳ باب ۷ آیت میں لکھتا ہے "پھر اگر میرے جھوٹ کے سبب خدا کی سچائی اس کے جلال کے لیے زیادہ ظاہر ہوئی تو مجھ پر کیوں گنہگار کی طرح حکم ہوتا ہے" - میں سچ سچ کہتا ہوں کہ اگر عیسائیوں کے درمیان ایک انسان بھی ایسا منقد اور محتاط نہیں تو ایسا دیانتدار ہی ہوتا جیسا اسلام کے یہ عظیم الشان محدثین تھے تو حضرت مسیح کا مذہب کچھ نہ کچھ ضرور اپنی اصلیت پر رہ جاتا مگر افسوس کہ ان لوگوں نے مسیح کو خدا بنانے کے لیے طرح طرح کے جھوٹ سے کام لیا اور انکے بڑے بڑے اسقف یہ اصل اپنے مدنظر رکھتے تھے جسکو یوسیبیئس ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ "میں نے وہ تمام باتیں بیان کر دی ہیں جن سے ہمارے مذہب کا جلال ظاہر ہوا اور ان تمام باتوں کو دبا یا ہے جن سے ہمارے مذہب پر کسی طرح سے زد پڑتی تھی" پس ایسے ایسے حامیان دین کے ہوتے ہوئے جو کھلے طور پر اپنے اصول کو ان الفاظ میں بیان کرتے تھے ہم یقین کر سکتے ہیں کہ عیسائی مذہب کی جو کچھ تحریریں ہمارے ہاتھ میں ہیں ان میں بہ نسبت راستی کے جھوٹ زیادہ ہے - مسلمانوں میں بھی ایسے آدمی ہوئے جنہوں نے جھوٹی احادیث بنا کر مشہور کیں مگر مسلمان علماء اور محدثین نے انکی جھوٹ کو دین میں ملنے نہیں دیا اور ان جھوٹوں سے جنکے بنانیوالے اکثر یا تو خود غرض فرقے تھے یا زندیق لوگ جو مذہب اسلام کو ان جھوٹوں سے نیست و نابود کرنا چاہتے تھے اہل اسلام نے اسوقت سے لیکر آجتک ہمیشہ بیزاری ظاہر کی ہے - اور انکی ناپاک جھوٹوں سے لوگوں کو بچانیکے لیے فی الفور کتابیں تصنیف کیں - مگر مذہب کی ترقی کی خاطر جھوٹ بولنا جسکا پولوس اور اسکے بڑے بڑے جانشین اسقف فخریہ اقرار کرتے ہیں اسلام اس ناپاکی سے ہمیشہ پاک رہا ہے کیونکہ اس کے بانی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پہلے سے ہی اپنی امت کو متنبہ کر دیا تھا کہ جو شخص میرے نام سے جھوٹ بنائیگا اسکا ٹھکانا جہنم ہے - پس اسلام میں مذہب کی خاطر جھوٹ بنانا ایک سخت ناپاک جرم تھا مگر عیسائیت نے اسپر فخر کیا ہے - پھر جن لوگوں کے گھر میں یہ حالت ہو انکو اسلام کے

اسلامی اور مسیحی جنگوں کا مقابلہ

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کے مقابلہ سے عیسائی صاحبان کو رنج پہنچیگا مگر ہمیں خود اس مقابلہ کی ضرورت نہ تھی اگر عیسائی صاحبان اپنی کتب مقدسہ کو مطالعہ کرکے کم ازکم ان اعتراضات کے کرنے سے رُکے رہتے جو انکی اپنی کتابوں پر اور اپنے بزرگوں پر وارد ہوتے ہیں۔ مگر یہ بات پادری صاحبان کی عادت میں داخل ہوگئی ہے کہ وہ خواہ نخواہ اسلام پر اعتراض کرتے رہتے ہیں۔ اور خصوصاً اسلامی جنگوں پر زیادہ زور دیتے ہیں اور اس سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام اپنی ذاتی خوبیوں کے سبب سے نہیں پھیلا بلکہ بزور شمشیر پھیلا ہے۔ اس اعتراض میں کچھ مدد ان دشمنان دین کو وہ لوگ دیرہے ہیں جو ایک غازی مہدی کے آنیکا عقیدہ رکھتے ہیں کیونکہ وہ گویا اس بات کے خود مقر ہو جاتے ہیں کہ اسلام میں تلوار کے ذریعہ مذہب کا پھیلانا جائز ہے اور کہ اسلام کی ترقی تلوار پر ہی منحصر ہے۔ یہ وقت تھا کہ مسلمان سچی قرآنی تعلیم پر غور کرکے ان غلط عقاید کے مٹانیکی کوشش کرتے تا اسلام کے منور چہرہ سے اعتراضوں کے سیاہ داغ دور ہوکر یہ اپنی روشنی دنیا میں پھیلا سکے مگر ہمارے مسلمان بھائی بے سمجھی سے یا ہٹ دھرمی سے اس غلطی پر اڑے ہوئے ہیں جو فیج اعوج کے زمانہ میں اسلام میں داخل ہوگئی اسوقت میری غرض صرف پادری صاحبان کو یہ دکھانا ہے کہ جو اعتراض وہ اسلام پر کرتے ہیں وہ اسلام پر نہیں بلکہ خود انکے اپنے مذہب پر عائد ہوتا ہے۔ یہ لوگ بار بار اپنی تحریروں میں اسلام کو تلوار کا مذہب اور عیسائیت کو صلح کا مذہب کہتے ہیں اور اگرچہ بارہا انکی ان باتوں کا جواب دیا گیا ہے مگر وہ پھر وہی اعتراض کرتے چلے جاتے ہیں حال میں یہی مضمون اخبار اپی فینی میں جو پادریوں کا انگریزی کا دو ورقہ پرچہ ہے چھیڑا گیا۔ جسکا جواب ایک مسلمان نے اخبار مذکور کو لکھا مگر ایڈیٹر اخبار نے بجائے اس غلطی کو تسلیم کرنیکے پھر وہی اعتراضات اپنی اخبار میں دوہرا دیئے ہیں۔ اخبار مذکور اخیر میں اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ عیسائیوں نے بھی بعض اوقات عیسائی مذہب کے پھیلانیکے لیے تلوار کو ہاتھ میں پکڑا ہے مگر وہ کہتا ہے کہ ایسا کرنے میں انہوں نے مسیح کی تعلیم کو چھوڑ دیا اس جواب سے پادری صاحبان آسانی سے اپنا چھٹکارا چاہتے ہیں مگر انکا چھٹکارا ایسا آسان نہیں جیسا انہوں نے خیال کیا ہے۔

اس مضمون کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ دیکھا جاوے کہ حضرت مسیح کی آمد کسطرح ہوئی۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ مسیح کا آنا یہودیوں کے انتظار کے مطابق تھا اور ان لوگوں کو ابتدا سے یہ امید دلائی گئی تھی کہ جب مسیح دنیا میں ظاہر ہوگا اُسوقت یہودی قوم دنیا کی تمام قوموں پر غالب آجائیگی۔ اور مسیح انکی سلطنت کو دوبارہ قایم کریگا اور دوسری قوموں کی حکومت کے جوئے سے انکو چھڑائیگا چنانچہ جب حضرت عیسیٰ نے پہلے دعویٰ مسیحیت کیا تو غالباً انہی پیشگوئیوں کی بنا پر انکا بھی یہ خیال تھا کہ وہ یہودیوں کے بادشاہ ہونگے چنانچہ داؤد کے تخت کو قائم کرنیکا خیال

ایک مدت تک آپکے دل میں رہا۔ مگر عیسائی مذہب کو بانیٔ مذہب کی زندگی میں اسقدر طاقت حاصل نہ ہوئی تھی کہ وہ تلوار سے کام لے سکے اور جب کچھ عرصہ کے گذر نیکے بعد ظاہری طاقت اس مذہب کو حاصل ہوئی تو پھر اس نے نہایت بے رحمی کے ساتھ تلوار سے کام لیا اور تلوار کے ذریعہ بہت سی ترقی حاصل کی۔ حضرت عیسیٰ کے پاس اگر اسقدر طاقت ہوتی کہ اس کے زور پر وہ رومی سلطنت کو فتح کرنیکی امید کر سکتے یا کم از کم کوئی بڑی تعداد جان نثار مریدوں کی ہی ان کے ساتھ ہوتی اور پھر وہ تلوار نہ اٹھاتے تو ہم کہہ سکتے تھے کہ جن عیسائیوں نے بعد کے زمانہ میں تلوار اٹھا کر بہت سی مخلوق خدا کو تہ تیغ کیا۔ انہوں نے حضرت مسیح کی تعلیم کی خلاف ورزی کی۔ مگر جس صورت میں حضرت مسیح کو کبھی یہ طاقت حاصل ہی نہیں ہوئی کہ وہ تلوار اٹھا سکیں اور نہ ہی انکے حواریوں میں اسقدر جرأت تھی کہ وہ ایسا کام کر سکتے تو پھر یہ کہنا کسی صورت میں درست نہیں ہو سکتا کہ عیسائی مذہب کی بعد کی خونریزی حضرت مسیح کی تعلیم کے خلاف تھی۔ بلکہ باوجود ہر قسم کی بے سروسامانی کے اور بے یار و مددگار ہونیکے بھی حضرت مسیح نے تلوار کو اپنے دین کے لیے نہایت ضروری سمجھا یہانتک کہ اپنے حواریوں کو صاف الفاظ میں یہ حکم دیا کہ جس کے پاس تلوار نہیں وہ کپڑے بیچکر بھی تلوار خریدلے۔ اور اگرچہ بیچارے حواری اس تعلیم پر عمل نہ کر سکے مگر عیسائیوں کی بعد میں آنے والی نسلوں نے تو اسی ایک حکم کو عیسائی مذہب کی تعلیم کا لب لباب سمجھا اور اسی پر عمل کر کے تلوار سے خوب کام لیا۔ اور حکموں میں خواہ بعد کے عیسائی لوگ اصل عیسوی تعلیم سے کتنے ہی دور جا پڑے مگر اس تلوار خریدنے کے حکم کی انہوں نے خوب تعمیل کر کے دکھائی۔ ہاں حضرت مسیح کو خود اپنی زندگی میں یہ موقع پیش نہ آیا کہ وہ اس خواہش کو کہ کپڑے بیچکر تلواریں خریدی جاویں پورا ہوتے دیکھتے اور اس لیے یہ بھی نہ ہوا کہ حضرت مسیح انکو یہ ہدایت دیتے کہ تلوار کو کس کس موقع پر استعمال کرنا چاہیئے۔ لیکن جسقدر واقعات انکے متعلق انجیلوں سے ملتے ہیں انکو بغور پڑھ کر ہم اس امر کے متعلق ایک صحیح اور یقینی قطعی نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ اگر حضرت مسیح کو خود یہ موقع پیش آتا کہ وہ تلوار کو استعمال کریں تو وہ کیا کرتے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ عیسائی صاحبان کبھی اس بات پر خوش نہیں ہو سکتے کہ حضرت عیسیٰ کو صلح کے شہزادہ کے سوائے کسی دوسرے نام سے پکارا جائے اگرچہ خود حضرت مسیح بجائے صلح کا شہزادہ کہلانے کے تلوار چلانیوالے کا نام پسند کرتے تھے جیسا کہ متی باب ۱۰ آیت ۳۴ میں لکھا ہے کہ "یہ مت سمجھو کہ میں زمین پر صلح کروانے آیا صلح کروانے نہیں بلکہ تلوار چلانیکو آیا ہوں" مگر عیسائی صاحبان کی ناراضگی کی وجہ سے ہم واقعات کا اخفا نہیں کر سکتے اور اظہار حق کے لیے یہ ضروری ہے کہ جس صورت میں ہمارے معترض اسلام پر طرح طرح کے جھوٹے عیب لگاتے ہیں تو ہم کم از کم واقعات حقہ کا ہی اظہار کریں۔ حضرت مسیح نے یہودی شریعت کے مطابق تعلیم پائی اور اسی شریعت پر انکا پختہ اعتقاد تھا اور وہ سچے دل سے یہودی مذہب اور اسرائیلی شریعت کے پیرو تھے۔ بلکہ یہودی شریعت کے شریعت حقہ ہونے پر اسقدر انکا اعتقاد تھا کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ "زمین اور آسمان

ٹلجائیں مگر توریت کا ایک لفظ یا ایک شعشہ ہرگز نہیں ٹلیگا جب تک سب کچھ پورا نہ ہو پس جو کوئی ان حکموں میں سے سب سے چھوٹے کو ٹال دیوے اور ویسا ہی آدمیوں کو سکھاوے آسمان کی بادشاہت میں سب سے چھوٹا کہلائیگا پر جو کہ عمل کرے اور سکھلاوے وہی آسمان کی بادشاہت میں بڑا کہلائیگا" متی باب ۵ آیت ۱۸ و ۱۹۔ پس ہم قطعی طور سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر حضرت مسیح کو تلوار چلانیکا موقع ملتا تو وہ اسی طرح پر چلاتے جیسے شریعت موسوی میں احکام پائے جاتے ہیں۔ جو شخص ان احکام سے واقف نہیں اسے چاہیئے کہ کتاب استثنا دیکھے جہاں لکھا ہے کہ جب تو اپنے دشمنوں پر قابو پاوے" اور جبکہ خداوند تیرا خدا انہیں تیرے حوالے کرے تو تو انہیں ماریو اور حرم کیجیو نہ تو ان سے کوئی عہد کریو اور نہ انپر رحم کریو" استثنا باب ۷ آیت ۱ و ۲۔ اور پھر چند باب آگے چلکر لکھا ہے کہ "تو اس شہر (یعنی بت پرستوں کے شہر) کے باشندوں کو تلوار کی دھار سے ضرور قتل کریگا اور سب کچھ جو اس شہر میں ہے اور وہاں کے مواشی کو تلوار کی دھار ہی سے نیست و نابود کریگا اور اسکی ساری لوٹ کو وہاں کے کوچے کے بیچوں بیچ اکٹھا کریگا اور اس شہر کو اور وہیں کی لوٹ کو خداوند اپنے خدا کے لیے آگ سے جلا دیگا۔ اور وہ ہمیشہ کو ایک ٹیلہ ہوگا اور پھر بنایا نہ جائیگا" باب ۱۳ آیت ۱۵۔ اور ایسا ہی استثنا باب ۲۰ آیت ۱۶ و ۱۷ میں لکھا ہے "لیکن ان قوموں کے شہروں میں جنہیں خداوند تیرا خدا تیری میراث کر دیتا ہے کسی چیز کو جو سانس لیتی ہے جیتی نہ چھوڑیو بلکہ تو ان کو حرم کیجیو"

اب اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ جو شخص یہ تعلیم دیتا ہے کہ توریت کے حکموں کا ایک لفظ یا شعشہ بھی منسوخ نہیں ہو سکتا اور جو کوئی ان حکموں میں سے سب سے چھوٹے کو ٹال دیوے وہ آسمان کی بادشاہت میں سب سے چھوٹا کہلاویگا وہ خود ضرور ان احکام پر عمل کرتا اور جنگوں کے متعلق جو احکام تھے ان میں یسوع مسیح نے کوئی تبدیلی نہیں کی بلکہ انکے پورا کرنیکی بھی ایسی ہی ضرورت سمجھی ہے جیسی دوسرے کسی حکم کی۔ پس اگر عیسائی مذہب کو حضرت مسیح کی زندگی میں اسقدر اقتدار حاصل ہوتا کہ وہ تلوار پکڑ کر دنیا میں نکل سکتا تو جو کارروائیاں بعد میں ہوئیں وہ سب یسوع مسیح کی زندگی میں ہی ہوتیں کیونکہ ضرور تھا کہ اسوقت حضرت مسیح توریت کے حکم کے مطابق عمل کرتے۔ میں نہیں سمجھتا کہ باوجود ان سب واقعات کے یہ کسطرح کہا جا سکتا ہے کہ بانی عیسائیت پیچھے آنیوالے عیسائیوں کی خونریزیوں کا ذمہ وار نہیں۔ کیونکہ خود اس مذہب کے بانی نے ہی تلواریں خریدنیکا حکم دیا اور یہانتک ضرورت بتائی کہ کپڑے بیچکر بھی تلواریں خریدلو اور دوسری طرف اگرچہ خود تلوار کے استعمال کے متعلق کوئی فعل کر کے نہیں دکھایا مگر اپنی تعلیم کی رو سے یہ ضروری ٹھہرایا کہ تلوار کے ساتھ عام تباہی پھیلائی جائے جیسے بنی اسرائیل پھیلاتے تھے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ جب کہ حضرت مسیح نے خود ہی فرمایا کہ درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ عیسائیوں کی خونریزیوں کا الزام حضرت

مسیح پر نہ پڑے بلکہ انکی زندگی کے اور واقعات جو اناجیل میں مندرج ہیں یہی بتاتے ہیں کہ انکے دل میں کم از کم ایک مدت تک ضرور یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ زور سے بھی کچھ کام لینا چاہیئے جس کی اصل وجہ یہ تھی کہ انکو ابتدا میں یہ اجتہادی غلطی لگی تھی کہ وہ داؤد کے تخت کو قایم کریں گے اور سلطنت کریں گے۔ انکی زندگی میں ایک موقعہ خصوصیت سے ایسا پیش آیا جب انکی یہ امیدیں معمول سے کچھ زیادہ سرسبز ہو گئی تھیں۔ اور اسی موقع پر آپنے نرمی کے طریق کو چھوڑ کر سختی کا طریق اختیار کیا اور وعظ کی بجائے زور سے اور ڈنڈوں سے کام لیا۔ یہ موقع وہ تھا جب آپ یروشلم میں داخل ہوئے۔ اس وقت آپ ایک گدھے پر سوار تھے اور اسکی غرض جیسا کہ متی بیان کرتا ہے یہ تھی کہ آپ اس پیشگوئی کو پورا کریں جس میں مسیح کو یہودیوں کا بادشاہ کہا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال آپکے دل میں اُسوقت غالب تھا متی کے الفاظ یہ ہیں "یہ سب کچھ ہوا تاکہ جو نبی نے کہا تھا پورا ہو کہ صیحون کی بیٹی سے کہو دیکھ تیرا بادشاہ فروتنی سے گدھی پر اور گدھی کے بچہ پر سوار ہو کر تجھ پاس آتا ہے" متی باب ۲۱ آیت ۳ و ۴۔ اس تمام واقعہ کو پڑھکر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یسوع مسیح کو اُسوقت یہ انتظار تھا کہ اب وہ دم کے دم میں بادشاہ بنایا جاویگا۔ اور عوام الناس اسی خیال سے اس کے ساتھ ہو لیے اور بازاروں میں درختوں کی ٹہنیاں اور کپڑے بچھا دیئے اور ابن داؤد کو ہوشعنا کے نعرے بلند کیے۔ اس موقع پر یہ سمجھ کر کہ اب عوام الناس آپکے ساتھ ہیں حضرت مسیح ہیکل میں گئے جہاں چند ہی منٹوں میں ایک عجیب و غریب نظارہ دیکھا گیا۔ یعنی "اُن سب کو جو ہیکل میں خرید و فروخت کرتے تھے نکال دیا اور صرافوں کے تختے اور کبوتر فروشوں کی چوکیاں اُلٹ دیں" متی باب ۲۱ آیت ۱۲۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کو یہ جوش اسوجہ سے آیا کہ خبیث طبع لوگوں نے خدا کی عبادت کے گھر کو بالفاظ انکے "چوروں کا کھوہ" بنا دیا۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ اگر یہ سختی محض ایک بُرے کام کے دور کرنیکے لیے روا رکھی گئی اُسوقت اگر آپکے ہاتھ میں تلوار ہوتی تو اس سے کیا کیا سختی نہ کرتے۔ ہم کبھی یہ مان نہیں سکتے کہ ان انبیائے بنی اسرائیل نے جنہوں نے تلوار سے بت پرستوں کو نیست و نابود کیا کسی سلطنت کے لالچ پر یا جوش نفس سے ایسا کیا تھا نہیں بلکہ انکو خدا کی عزت کے لیے سچا جوش تھا۔ انہوں نے اس لیے ایسی سختی برتی کہ بت پرستی جیسی ناپاک رسم کا اور کسی طرح سے مٹانا مشکل تھا۔ غرضکہ انہوں نے بھی جوش حق سے تلوار اٹھائی اور حضرت مسیح نے بھی جوش حق سے چند تاجروں کو مار کر ہیکل سے باہر نکال دیا اور انکے تختے اور چوکیاں تہ و بالا کر دیں۔ اور اگر انکے ہاتھ میں تلوار ہوتی اور انکے پاس کافی جمعیت ہوتی تو وہ ضرور اپنے بزرگوں یعنی پہلے انبیائے بنی اسرائیل کے نقش قدم پر چلتے بہر حال اس میں کچھ شک نہیں کہ اس موقع پر حضرت مسیح نے جبر کا استعمال کیا اور کوئی وجہ نہیں کہ اگر وہ کر سکتے تو تلوار کو اسی غرض کے لیے استعمال نہ کرتے۔ پس اس سے صاف شہادت ملتی ہے کہ پچھلے عیسائیوں میں جنہوں نے جنگ کیئے مسیح کی روح ہی کام کر رہی تھی۔

اخبار اپی فینی میں کپڑے بیچکر تلواریں خریدنے والے حکم کی ایک تشریح کی گئی ہے جسکی رکاکت یہ سفارش کرتی

ہے کہ میں اپنے ناظرین کو اس سے محروم نہ رکھوں۔ ایڈیٹر صاحب مذکور نہایت متانت سے لکھتے ہیں کہ حضرت مسیح کے اس فقرہ پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ انکی مراد تلواروں سے جسمانی تلواریں نہ تھیں بلکہ روحانی تلواریں مراد تھیں۔ اس کے اپنے الفاظ یہ ہیں "جہاں مسیح تلوار کا ذکر کرتا ہے اسکی مراد اس سے حقیقی تلوار نہیں بلکہ روح کی تلوار مراد ہے۔ اس کا منشاء یہ ہے کہ صداقت اور راستبازی کی خاطر عیسائیوں کو ہمیشہ اور ہر جگہ بطور حملہ اور بطور مدافعت جنگ کرنی پڑیگی" میں اس تفسیر پر زیادہ بحث نہیں کرنی چاہتا مگر فاضل مفسر سے صرف اسی قدر دریافت کرتا ہوں کہ اس فقرہ میں تلوار کے علاوہ جن چیزوں کا ذکر ہے وہ بھی روحانی ہی ہیں یا جسمانی ہیں مثلاً ہدایت تو یہ ہے کہ کپڑے بیچکر تلواریں خریدیں۔ اب یہ تعلق جو اس فقرہ میں تلواروں اور کپڑوں کے درمیان ہے وہ ایسا ہے کہ اگر ایک کو جسمانی مانیں تو دوسرے کو بھی جسمانی ماننا پڑے گا اور ایک کو روحانی مانیں تو دوسرے کو بھی روحانی تسلیم کرنا پڑے گا۔ پس سوال یہ ہے کہ آیا جس صورت میں بموجب تشریح پادری صاحب کے اس جگہ تلواروں سے مراد روحانی تلواریں ہیں تو کپڑوں سے مراد روحانی لباس ہوا — اور روحانی لباس تقوے کو کہتے ہیں تو پس اس ہدایت کے یہ معنے ہوئے کہ تم اپنا روحانی لباس یعنی تقویٰ بیچکر مدافعت اور حملے کے لیے روحانی تلواریں خرید لو۔ یا بالفاظ دیگر تقوے کی راہوں کو چھوڑ کر جسطرح چاہو اپنے مذہب کے اصول کو بیان کرو اور جسطرح چاہو دوسرے مذاہب پر حملہ کرو۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا یہی معنے اس تلواروں والے حکم کے ہیں اس پر عیسائی صاحبان نے عمل تو ضرور کیا ہے یعنی تقوے کی راہوں کو چھوڑ کر یہ جھوٹ بنایا کہ عیسیٰ مسیح خدا تھا اور تقوے کی راہوں کو چھوڑ کر اسلام جیسے مقدس مذہب پر نہایت ناپاک حملے کیے۔ شاید انجیل کی اسی ہدایت کی رو سے عیسائی مذہب یہ سب کچھ کر رہا ہے۔ سوائے اسکے اور کوئی معنے اس فقرے کے نہیں بن سکتے۔ پس عیسائی صاحبان خود فیصلہ کر لیں کہ آیا انکو جسمانی تلوار والے معنے پسند ہیں یا روحانی تلوار والے۔ ایک اور سوال بھی ان معنوں کے رو سے پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سے اگلی آیت میں حواریوں نے دو تلواریں حضرت مسیح کو دکھائیں کہ یہ موجود ہیں جسپر حضرت مسیح نے فرمایا کہ یہ کافی ہیں۔ دیکھو لوقا باب ۲۲ آیت ۳۸ "انہوں نے کہا دیکھ اے خداوند یہاں دو تلواریں ہیں اس نے انسے کہا بہت ہے"۔ اب سوال یہ ہے کہ مسیح کا یہ حکم پانے پر کہ تلواریں خریدو جو دو تلواریں حواریوں نے آپ کو دکھائیں اور جنکو دیکھکر حضرت مسیح کو بھی ایک گونہ اطمینان ہو گیا وہ روحانی تلواریں تھیں یا جسمانی۔ امید ہے پادری صاحبان ان دو تین سوالوں کا جواب دیکر ممنون کریں گے۔

مگر ہم مسلمان حضرت مسیح کو اس بات کے لیے کہ انہوں نے تلواریں خریدنے کا حکم کیوں دیا ملزم نہیں ٹھہراتے کیونکہ حضرت مسیح علیہ السلام یہودی شریعت کے پیرو تھے۔ وہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے ایک تھے اور اس لیے شریعت

اسرائیلی کی پیروی کرنیکی وجہ سے اپر کوئی الزام عائد نہیں ہو سکتا۔ یہ کہا جائیگا کہ انکے اور دیگر انبیائے بنی اسرائیل کی تعلیم میں یہ فرق ہے کہ حضرت مسیح دشمنوں سے پیار کرنیکی تاکید فرمایا کرتے تھے اور اسرائیلی نبی بدلہ لینے پر زور دیتے تھے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ یسوع کی یہ تعلیم کہ تم اپنے دشمنوں سے محبت کرو یہ بھی اصل میں آپ کی باقی تعلیم کی طرح پہلے انبیاء سے ہی لی گئی ہے۔ مثلاً امثال میں حضرت سلیمانؑ کا یہ قول لکھا ہے کہ "اگر تیرا دشمن بھوکا ہو اسے روٹی کھانیکو دے اور اگر وہ پیاسا ہو اسے پانی پینے کو دے" امثال باب ۲۵ آیت ۲۱۔ اور حضرت داؤدؑ زبور میں یوں دعا کرتے ہیں "اے میرے خدا اگر میں نے اس سے جو مجھ سے میل رکھتا تھا بدی کی ہو (نہیں بلکہ میں نے اس کو بھی جو بلا وجہ میرا دشمن تھا نجات دی ہے)" زبور باب ۷ آیت ۴۔ اسی طرح پہلے نبیوں کی تعلیم جا بجا عفو اور درگذر اور محبت اور صلح جوئی کی تاکید سے بھری ہوئی ہے۔ اور حضرت مسیح نے صرف اسی پرانی تعلیم کو ایک نئے قالب میں پیش کیا ہے۔ پس یہ بڑی غلطی ہے جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ نبی جنہوں نے بت پرستوں کے ساتھ جنگ کر کے انکو تہ تیغ کیا وہ اخلاقی تعلیم اور محبت اور حلم اور بردباری کی تعلیم نہ دیتے تھے۔ اور حضرت مسیح چونکہ انہی بزرگ لوگوں کے نقش قدم پر چلنے والے تھے اس لیے انہوں نے نہ صرف انکی اخلاقی تعلیم کو ہی اپنے الفاظ میں پیش کیا بلکہ جو تعلیم انکی تلوار کے متعلق تھی اسکو بھی انہوں نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ اور اگر موقع ہوتا تو شاید آپ خود بھی اسپر عمل کر کے دکھاتے۔ اور اس کمی کو اسطرح پورا کیا کہ اپنے آخری وقت میں اپنے شاگردوں کو تلواریں خریدنے کا حکم دیا۔ آخری وقت میں نے اس لیے کہا کہ انجیل کی رو سے اس کے جلد ہی بعد وہ پکڑے گئے کیونکہ انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہدایت صادر کرنیکے بعد آپ تھوڑی دیر دعا میں مشغول رہے اور اس کے بعد جلد ہی پکڑے گئے پس یہ آپ کی وصیت تھی جسے وہ اپنے پیرووں کے پورا کرنیکے لیے چھوڑ گئے۔ اور انہوں نے بھی دل کھولکر اس وصیت کو پورا کیا۔

اس واقعہ کے متعلق ایک اور عجیب بات ہے جس کا میں اسجگہ ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ جب حضرت مسیح نے شاگردوں کو حکم دیا کہ اپنے کپڑے بیچکر تلواریں خریدیں تو انہوں نے دو تلواریں جو انکے پاس موجود تھیں پیش کیں۔ اور حضرت مسیح نے ان دو تلواروں کو کافی سمجھا۔ مگر یہ ظاہر نہیں کیا گیا کہ کس غرض کے لیے ان دو تلواروں کو آپنے کافی قرار دیا۔ انہیں میں سے ایک تلوار کے ساتھ پطرس نے تھوڑی دیر بعد ان آدمیوں میں سے ایک کا کان اڑا دیا جو حضرت مسیح کو گرفتار کرنے آئے تھے۔ پس یہی ایک موقع تھا جب ان دو تلواروں میں سے ایک کام میں لائی گئی۔ یہ اغلب ہے کہ کچھ اور خونریزی بھی اس موقع پر ہوتی اگر حضرت مسیح اپنے حواریوں کی بزدلی اور مخالفین کی کثرت کو جو تلواروں سے مسلح تھے دیکھکر اپنے ساتھیوں کو روک نہ دیتے اور اسطرح پر مجمع کے جوش کو کم نہ کر دیتے۔ ممکن بلکہ اغلب ہے کہ حضرت مسیح کو پہلے یہ خیال ہو کہ آپ کو ایک معمولی واعظ سمجھ کر دو ایک آدمی گرفتاری کے لیے آجاویں گے اور اسی لیے انہوں نے دو تلواروں پر اطمینان ظاہر کیا تھا۔ کیونکہ انکا خیال ہوگا کہ دو ایک آدمیوں کے مقابلہ کے لیے دو تلواریں

کافی ہیں۔ مگر جب انہوں نے ایک بڑا مجمع دیکھا اور سب آدمیوں کو مسلح پایا تو وہ بہت حیران ہوئے اور کہا کہ تم تو اس طرح تلواریں اور لاٹھیاں لیکر آئے ہو جیسے چور پکڑنے کو لوقا باب ۲۲ آیت ۵۲۔ ہم اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ حضرت مسیح نے اسوقت عین مصلحت کے مطابق کام کیا۔ مگر مشکل یہ پیش آتی ہے کہ آپ خدا کے نبی تھے اور آپ کا دو تلواروں کو کافی قرار دینا ایک بے معنی اور لغو امر نہیں ہو سکتا۔ آخر اس بات کا مطلب کیا تھا کہ دو تلواریں کافی ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ عیسائی صاحبان ضرور اس کا جواب دیں گے۔ ساتھ ہی میں ایک اور واقعہ بھی انکے غور کے لیے پیش کرتا ہوں۔ یہ بھی دو تلواروں کا واقعہ ہے مگر ان دو تلواروں کے ذریعے ایک عظیم الشان فتح ہوئی جو انسانی وہم و گمان سے بڑھکر تھی۔ یہ بدر کی فتح تھی۔ جہاں مسلمان نہ صرف تعداد کے لحاظ سے ہی بہت تھوڑے تھے بلکہ ان تھوڑوں میں بھی اکثر ایسے تھے جو پہلی دفعہ میدان جنگ میں آئے تھے۔ اور ہتھیار بھی کچھ نہیں تھے گھوڑا صرف ایک تھا اور مقابل پر دشمن ایک ہزار مسلح جوان جو جنگ آزمودہ تھے۔ اور اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ اسلام کا نام صفحۂ دنیا سے مٹا دیں۔ اور مسلمانوں کو اگر اپنے دین اور اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا خیال نہ ہوتا تو کبھی وہ ایسا مقابلہ نہ کرتے۔ غرضکہ یہ وہ موقع تھا جہاں دو تلواروں نے وہ کام کر دکھایا جس کا خیال غالباً حضرت مسیح کو بھی تھا۔ یعنی دشمنان دین کو نیست و نابود کیا اور چھوٹی سی اسلامی جمعیت کو مظفر و منصور کیا۔ اس سوال کا کہ حضرت مسیح کو یہی دو تلواریں کام کرتی ہوئی کشفی رنگ میں نظر آگئی تھیں میں ابھی کچھ جواب نہیں دیتا اور پادری صاحبان سے دو تلواروں کے کافی ہونیکی توجیہ سننے کا منتظر ہوں۔

یہ تو عیسائی مذہب کا تلوار سے تعلق تھا۔ اب دوسرا پہلو جو صاف کرنیکے قابل ہے وہ اسلامی جنگوں کا پہلو ہے اسکے متعلق میں مفصل کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ کیونکہ اس مضمون پر بارہا بحث کی جا چکی ہے اور قرآن کریم نہایت مختصر الفاظ میں مندرجہ ذیل دو مقامات میں صاف طور پر اسکو بیان فرماتا ہے کہ کن حالات کے ماتحت اسلام کو تلوار اٹھانی پڑی اور اس کی غرض اس میں کیا تھی۔ اول سورہ حج کی مفصلہ ذیل آیات ہیں۔

اذن للذین یقاتلون بانہم ظلموا ؕ و ان اللہ علی نصرہم لقدیر ۙ الذین اخرجوا من دیارہم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ ؕ ولولا دفع اللہ الناس بعضہم ببعض لھدمت صوامع و بیع و صلوٰت و مسٰجد یذکر فیہا اسم اللہ کثیرا ؕ یعنی مسلمانوں کو جنکے ساتھ جنگ کیا جاتا ہے اب اجازت دیجاتی ہے کہ وہ بھی کافروں سے لڑیں اسواسطے کہ ان پر بڑے بڑے ظلم کیے گئے ہیں اور بیشک اللہ تعالیٰ انکی مدد کرنے پر قادر ہے۔ یہ وہ مظلوم لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے ہیں صرف اس لیے کہ وہ اللہ کو اپنا پروردگار کہتے تھے۔ اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ہاتھ سے نہ ہٹواتا رہتا تو صومعے اور گرجے اور عبادتخانے اور مسجدیں جن میں کثرت سے خدا کا نام لیا جاتا ہے کبھی کے ڈھائے

جا چکے ہوں۔ دوسرا موقع سورہ بقرہ میں ہے جہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ط ان اللہ لا یحب المعتدین ...... فان قتلوکم فاقتلوھم ط کذلک جزاء الکافرین ۰ فان انتھوا فان اللہ غفور رحیم ۰ وقاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃ ویکون الدین للہ ط فان انتھوا فلا عدوان الا علی الظٰلمین ۰ اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور اس حد سے آگے نہ بڑھو کیونکہ اللہ اپنی مقرر کی ہوئی حدود سے آگے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا...... پس اگر وہ تم سے لڑیں تو تم بھی انکو قتل کرو کافروں کی یہی سزا ہے پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور یہانتک انسے لڑو کہ فتنہ باقی نہ رہے (یعنی جو تکالیف اسلام کی وجہ سے پہنچائی جاتی ہیں اور لوگوں کو اسلام سے پھرا جاتا ہے یہ فتنہ باقی نہ رہے) اور دین محض اللہ کے لیے ہو جائے (یعنی جو شخص دین کو اختیار کرنا چاہے اسکی راہ میں کوئی روک نہ ہو)۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو انکو چھوڑ دیا جاوے کیونکہ سزا صرف ظالموں کے لیے ہے"۔ یہ دونوں مقامات اسبات کو ثابت کرنیکے لیے کافی ہیں کہ کن حالات کے ماتحت اور کن اغراض کے لیے مسلمانوں کو جنگ کرنیکی مجبوری پیش آئی۔ کافروں نے انکو مکہ میں طرح طرح کے دکھ دیئے اور ایذائیں پہنچائیں اور آخر انکو انکے گھروں سے نکالدیا اور جب انہوں نے مدینہ میں جا پناہ لی تو وہاں بھی انکا پیچھا نہ چھوڑا۔ اور تلوار سے انکو نیست و نابود کرنا چاہا۔ اس نازک وقت میں جب اسلام ہر طرف سے دشمنوں سے گھرا ہوا تھا مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دیگئی۔

آیات مذکورہ بالا سے یہ کھلا کھلا ثبوت ملتا ہے کہ مسلمانوں نے تلوار اس لیے نہیں اُٹھائی کہ کافروں کو دین اسلام قبول کرنیکے لیے مجبور کریں بلکہ اس لیے کہ اسلام کو نیست و نابود کیا جانیسے بچائیں اور اس کے دشمنوں کے خطرناک حملوں کو روکیں۔ اسلام کے جنگ دین کی اشاعت کے لیے نہ تھے بلکہ دین کی حفاظت کے لیے تھے۔ اور وہ کافروں کو مجبور کیونکر کرسکتے تھے کیونکہ بلحاظ تعداد وہ عرب میں ایسے تھے جیسے سمندر میں ایک قطرہ۔ علاوہ اس کے قرآن کریم سے صاف صاف ثبوت اس بات کا اور بھی ملتا ہے کہ اسلام نے مذہب میں جبر کرنیکو منع کیا ہے۔ یہ ممانعت ایک ایسی سورت میں وارد ہوئی ہے جو مدینہ منورہ میں نازل ہوئی جہاں مسلمانوں کی لڑائیاں شروع ہو چکی تھیں اور اسلام کو قوت اور غلبہ ایک حد تک حاصل ہو چکا تھا۔ اور یہ وہی سورۃ ہے جس میں جنگ کی اجازت بھی مسلمانوں کو دیگئی ہے اور جس میں حکم ہے کہ اُسوقت تک جنگ کرو جبتک دین اللہ کے لیے ہو جائے۔ یہ ممانعت ان الفاظ میں ہے کہ لا اکراہ فی الدین یعنی دین میں اکراہ یعنی جبر نہیں ہونا چاہیئے۔ پس جس کتاب نے یہ اصل سکھایا ہو اسکے خلاف یہ کہنا کہ اس میں بہ جبر مسلمان کرنیکی ترغیب ہے محض حماقت ہے۔

ایسا ہی سورہ ممتحنہ میں دو آیتیں ایسی ہیں جنسے یہی معلوم ہوتا ہے اور یہ سورۃ قریب اخیر زمانہ کی نازل شدہ

ہے۔ وہ آیات یہ ہیں۔ لاینھٰکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم و تقسطوا الیھم ط ان اللہ یحب المقسطین ۰ انما ینھٰکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاھروا علیٰ اخراجکم ان تولوھم ج ومن یتولھم فاؤلٰئک ھم الظٰلمون ۰۔ اللہ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان کرنے اور منصفانہ برتاؤ کرنیسے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور نہ انہوں نے تمکو تمہاری گھروں سے نکالا کیونکہ اللہ منصفانہ برتاؤ کرنیوالوں سے محبت رکھتا ہے۔ اللہ تم کو ان لوگوں سے دوستی کرنیسے منع کرتا ہے جو تم سے تمہارے دین کے بارے میں لڑے اور تمکو تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالنے میں مددگار ہوئے جو شخص ایسے لوگوں سے دوستی رکھیگا وہی ظالم ہیں۔ ان آیات سے نہ صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان غیر مسلموں سے احسان کرنے اور منصفانہ برتاؤ کرنیکا حکم دیتا ہے جنہوں نے خود مسلمانوں سے انکے دین کی وجہ سے جنگ نہیں کیے۔ بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی کفار کی طرف سے تھی اور انکی غرض یہ تھی کہ مسلمانوں کو انکے دین سے پھیریں کیونکہ دین کی وجہ سے لڑنا اللہ تعالیٰ کفار کی طرف منسوب کرتا ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ قرآن شریف کے یہ چند مقامات میرے مدعا کو ثابت کرنیکے لیے کافی ہیں۔

جسقدر ثبوت اوپر دیا گیا ہے اس سے ایک طالب حق مطمئن ہو جاتا ہے کہ اسلامی جنگ دین کے پھیلانے یا بجبر دین اسلام قبول کروانیکے لیے ہرگز نہ تھے۔ مگر پادری صاحبان باوجود ایسے کھلے کھلے ثبوت کے انکار پر اصرار کرتے چلے جاتے ہیں چنانچہ اخبار اپی فنی کا ایڈیٹر اس تمام شہادت کو یہ کہکر رد کرتا ہے کہ یہ تمام احکام جو ان آیات میں مذکور ہوئے ہیں سورہ توبہ سے منسوخ ہو چکے ہیں اس کے اپنے الفاظ یہ ہیں کہ "خواہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دوسرے موقعوں پر کچھ ہی تعلیم کیوں نہ دی ہو یہ آخری سورۃ انکے خیالات کی آخری حالت کو بیان کرتی ہے"۔ اس کا جواب دینے سے پہلے میں پادری صاحبان سے یہ پوچھتا ہوں کہ کیا وجہ ہے کہ اسی منطق کو وہ انجیل پر نہیں لگاتے مثلاً یہ ایک موٹی بات ہے کہ حضرت مسیح کی ابتدائی تعلیم میں عفو اور درگذر اور دشمنوں سے محبت کرنے پر بہت زور دیا گیا ہے۔ جیسا کہ پہاڑی وعظ سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک گال پر طمانچہ لگے تو دوسری بھی پھیر دو۔ اور کوئی کوٹ مانگے تو چغہ بھی اتار دو اور ایک میل ساتھ لیجانیکے لیے مجبور کرے تو دو میل چلے جاؤ وغیرہ وغیرہ۔ مگر جوں جوں کچھ مرید اکٹھے ہوتے جاتے ہیں حضرت مسیح کی طرز کلام بھی بدلتی جاتی ہے۔ یہانتک کہ جب آپ گرفتار ہونے کو تھے تو اسوقت سب شاگردوں کو یہ حکم دیا کہ کپڑے بیچکر تلواریں خرید لو۔ یہ آپ کا آخری حکم تھا اور اس منطق کو استعمال کر کے جسکو پادری صاحب نے استعمال کیا ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس آخری حکم سے پہلے تمام حکم درگذر اور عفو اور طمانچہ کھانیکے منسوخ ہو گئے بلکہ عیسائی مذہب کی بعد کی تاریخ سے تو اسکا ثبوت بھی ملتا ہے۔ کیونکہ طمانچہ کھانیوالی اور چغہ دینے والی اور دو میل جانیوالی تعلیم پر تو کسی

عیسائی نے عمل کر کے نہ دکھایا البتہ تلواریں خریدنے والے حکم کی خوب تعمیل کر کے دکھائی امید ہے پادری صاحبان کو ان معنوں پر کوئی اعتراض نہ ہوگا کیونکہ عیسائی مذہب کی تاریخ سے انہی معنوں کی صداقت کا ثبوت ملتا ہے۔

اسلام کے خلاف جو اعتراض کیا گیا ہے کہ سورہ توبہ سے پہلے حکم منسوخ ہو گئے بالکل خلاف واقعہ ہے۔ میں اسجگہ ناسخ و منسوخ کی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا مگر اس میں شک نہیں کہ قرآن شریف میں اسکی کوئی نظیر پیش نہیں کیجا سکتی کہ کلام الٰہی نے پہلے ایک اصل کو قایم کیا ہو اور اسپر زور دیا ہو کہ ایسا کرنا چاہیئے اور پھر اسے منسوخ کر کے اس کے متضاد کوئی اور اصل بیان کیا ہو۔ پس جب قرآن شریف نہایت پُر زور الفاظ میں اور بار بار دوہرا کر کئی سورتوں میں اس اصل کو بیان کر چکا تھا کہ مذہب کے بارے میں جبر و اکراہ کو ہرگز کسی قسم کا دخل نہیں ہونا چاہیئے اور مذہبی آزادی کے اصل کو قایم کر چکا تھا تو اس حکم کے خلاف پھر اور کوئی حکم اس میں نہیں ہو سکتا۔ یہ دعویٰ میں نہیں کرتا بلکہ قرآن کریم نے خود یہ دعویٰ کیا ہے کہ ایسا اختلاف اسمیں نہیں پایا جاتا جیسا کہ فرماتا ہے۔ افلا یتدبرون القرآن ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا۔ یہ لوگ کیوں قرآن کریم پر تدبر نہیں کرتے کیونکہ اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو ضرور اس میں بہت سے اختلاف پاتے۔ پس جب بدلایل یہ ثابت ہو چکا کہ قرآن شریف نے جبر و اکراہ سے کھلے لفظوں میں روکا تو اب اس کے خلاف کوئی امر قرآن شریف میں ہرگز نہیں ہو سکتا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ آیا سورہ توبہ میں واقعی کوئی ایسا حکم جنگ کے متعلق ہے جس سے پہلے تمام احکام متعلقہ جنگ کی تنسیخ ہوتی ہے۔ اس بحث سے پہلے چند الفاظ کے معنوں کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ ان میں سے اول تو جہد کے مشتقات ہیں جیسے جہاد وغیرہ۔ سو خواہ کوئی سی عربی لغت دیکھی جاوے یہ معلوم ہوگا کہ جہد کے معنے سخت کوشش کرنیکے ہیں۔ اور ایسا ہی جہاد جسکے متعلق اسقدر غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے اسکے معنے بھی کسی امر کے خلاف کوشش کرنیکے ہیں اور وہ کوشش زبان سے ہاتھ سے تحریر سے مال سے اور کئی طرح ہو سکتی ہے یہ تو لغوی معنے ہوئے اب جب قرآن کریم کو دیکھا جاتا ہے تو اس میں بھی یہ لفظ ہر جگہ جنگ کے معنوں میں استعمال نہیں ہوا مثلاً سورہ عنکبوت میں جو مکہ میں نازل ہوئی تھی یہ لفظ چار جگہ مستعمل ہوا ہے جن میں سے ایک جگہ بھی جنگ کے معنے نہیں۔ ایسا ہی سورہ لقمن میں بھی یہ لفظ اسی طرح پر استعمال ہوا ہے بلکہ سورہ فرقان میں جو وہ بھی ایک مکی سورۃ ہے جہاد کبیر کا لفظ استعمال کیا ہے اور وہاں بھی معنے صرف کوشش کرنیکے ہیں۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔ فلا تطع الکفرین وجاھدھم بہ جہادا کبیرا۔ یعنی کافروں کا کہا نہ مانو بلکہ قرآن کے ذریعہ سے انکے ساتھ جہاد کبیر کرو۔ اسجگہ قرآنی دلایل سے کفار کا مقابلہ کرنیکا نام جہاد کبیر رکھا۔ ایسا ہی الفاظ فی سبیل اللہ کے معنوں میں عیسائی صاحبان نے ٹھوکر کھائی ہے یا عمداً دھوکہ دیتے ہیں اس فقرہ کے معنے یہ لوگ دین کی ترقی یعنی پھیلانے کے لیے کرتے ہیں اور ان غلط معنوں کی بنا پر یہ حملہ کرتے ہیں کہ جب قرآن شریف مومنوں کو یہ کہتا ہے کہ تم کفار کے ساتھ فی سبیل اللہ جنگ کرو

تو اسکا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تم اپنے دین کے پھیلانیکے لیے انکے ساتھ لڑائیاں کرو اور اس سے بجبر مسلمان کرنیکا نتیجہ نکالتے ہیں۔ سو یاد رہے کہ یہ معنے صحیح نہیں ہیں۔ الفاظ فی سبیل اللہ کے لفظی معنے ایسے صاف ہیں کہ ایک بچہ بھی انکے مفہوم کو سمجھ سکتا ہے۔ یعنی اللہ کی راہ میں یا محض خدا کے لیے نہ اپنے کسی ذاتی فایدہ یا غرض کے لیے یا اپنی نفسانی خواہش سے یا ریا سے۔ اور پھر سورہ توبہ سے ان الفاظ کو مخصوص کرنا اور بھی حماقت ہے۔ ابتدائی احکام جنگ میں بھی یہی ارشاد الٰہی ہوا ہے کہ تم فی سبیل اللہ کافروں کے ساتھ جنگ کرو پس اگر وہاں بجبر مسلمان کرنیکے معنے نہیں تو سورہ توبہ میں کیونکر ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ سورہ بقرہ میں فرماتا ہے۔ وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا۔ یعنی جنگ کرو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو تمہارے ساتھ جنگ کریں اور اس حد سے آگے نہ بڑھو۔ اب یہ جنگ جیسا کہ الفاظ سے ظاہر ہے صرف بطور مدافعت یا حفاظت اسلام کے لیے ہیں کیونکہ ان میں پیشدستی کرنیسے صاف طور پر منع کیا گیا ہے بلکہ یہی فرمایا ہے کہ جو تم سے جنگ کرتے ہیں انکے ساتھ تم بھی جنگ کرو اور اس حدبندی سے آگے مت نکلو۔ پس اگر یہاں جہاد فی سبیل اللہ کے یہ معنے نہیں کہ لوگوں کو بجبر مسلمان کرنیکے لیے جنگ کرو تو سورہ توبہ میں یہ معنے کیونکر ہوگئے۔ اس سے بھی بڑھکر یہ بات ہے کہ فی سبیل اللہ کا استعمال جنگ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ جہاں غریبوں کو صدقات دینے کا حکم ہے وہاں بھی فی سبیل اللہ کا لفظ ہی فرمایا ہے۔ مثل الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل۔۔۔
۔۔۔ الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ ثم لا یتبعون ما انفقوا منا ولا اذی لھم اجرھم عند ربھم۔ یعنی جو لوگ اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں انکی مثال اس دانے کی سی ہے جس سے سات بالیں پیدا ہوں۔۔۔۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر خرچ کیے پیچھے احسان نہیں جتاتے اور نہ ایذا دیتے ہیں انکے لیے انکے رب کے نزدیک بڑا اجر ہے۔ اب اس میں تو کسی پادری صاحب کو بھی شک نہ ہوگا کہ غریب کو مال دینے کا مطلب بجبر اسلام پھیلانا نہیں۔ پس فی سبیل اللہ کے سیدھے معنے اللہ کی راہ میں یا اللہ کے لیے ہیں نہ دین اسلام کا پھیلانا۔ یہاں فی سبیل اللہ کے بعد صاف طور پر فرمایا کہ پیچھے کسی قسم کا احسان نہ رکھو کیونکہ جو کام محض اللہ کے لیے اور اسی کی رضاجوئی کی خاطر کیا گیا ہے اس میں کسی پر احسان رکھنا گویا یہ ظاہر کرنا ہے کہ اللہ کے لیے وہ کام نہ کیا گیا تھا۔ اور جہاں فی سبیل اللہ جنگ کرنیکو کہا وہاں یہ منشاء ہے کہ مسلمانوں کا جنگ کرنا کچھ اپنے لیے تو ہے نہیں بلکہ چونکہ کفار دین الٰہی اور خدا کے مرسل کو نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں اور مسلمان محض اسی کی حفاظت کے لیے جنگ کرتے ہیں اسلیے انکے جنگ محض اللہ کے لیے اور اسی کی راہ میں ہیں۔ پس اس تمام بحث سے یہ ثابت ہے کہ محض لفظ جہاد سے یا جہاد فی سبیل اللہ سے بزور شمشیر دین اسلام پھیلانیکا نتیجہ نکالنا محض پادری صاحبان کے عناد اور تعصب کا نتیجہ ہے ورنہ الفاظ سے یہ معلوم نہیں ہوتا۔

اب سورہ توبہ کی ان آیتوں کو لیتے ہیں جن کو اخبار اپی فینی میں اس دعوے کی تائید میں پیش کیا گیا ہے کہ اس سورۃ میں بزور شمشیر دوسرے لوگوں کو مسلمان کرنیکا اصل قائم کیا گیا ہے۔ پہلی آیت سورہ توبہ کی اکتالیسویں آیت ہے انفروا خفافا وثقالا وجاھدوا باموالکم وانفسکم فی سبیل اللہ ذٰلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون۔ نکلو ہلکے اور بوجھل اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ اگر تم کو سمجھ ہے تو تمہارے حق میں بہتر ہے یہ آیت جنگ تبوک کے متعلق نازل ہوئی تھی۔ اور یہ ایک ایسا مسلم امر ہے کہ ہیوری نے بھی اسے تسلیم کیا ہے۔ اسلیے اب ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ جنگ تبوک کس قسم کا جنگ تھا آیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قوم کو مسلمان کرنیکے لیے یہ چڑھائی کی تھی۔ یا کسی کے حملہ کے دفعیہ کے لیے۔ سو یہ امر ثابت شدہ ہے کہ جنگ تبوک کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ اہل روم نے جو نصاریٰ تھے اور جن کی سرحد کے قریب بعض عیسائی قومیں مسلمان ہوگئی تھیں یہ ارادہ کیا تھا کہ ایک بڑی بھاری فوج کے ساتھ مسلمانوں پر چڑھائی کریں۔ یہ خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ نے بھی تیاری کردی اور سب مسلمانوں کو تیار ہونیکے لیے حکم دیا۔ اور تیس ہزار کا لشکر لے کر آپ مقام تبوک پر پہنچے۔ مگر نصاریٰ یہ خبر سنکر پہلے ہی اپنا عزم فسخ کر چکے تھے اور کوئی فوج انکی حملہ آور نہ ہوئی یہ دیکھکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بغیر لڑائی کرنے کے وہاں سے واپس آئے۔ یہ آیتیں مع اس سے ماقبل کی چند آیتوں اور بعد کی آیات کے تبوک کے لیے تیاری کے واسطے نازل ہوئی تھیں۔ پس اگر مہم تبوک کا مقصد کسی قوم کو بجبر مسلمان کرنا ہوتا تو بیشک اس آیت سے بھی یہ استدلال ہوسکتا تھا کہ قرآن کریم میں بجبر مسلمان کرنیکی ترغیب ہی نہیں بلکہ حکم ہے۔ لیکن اگر یہ مہم محض دفاعی اور کسی خطرہ کو روکنے کی غرض سے تھی تو اس سے بجبر مسلمان کرنیکا نتیجہ نکالنا حماقت ہے۔ اب پادری صاحبان خود ہی نتیجہ نکال لیں کہ انپر کونسی بات صادق آتی ہے تیس ہزار سپاہ کے ساتھ ہوتے ہوئے بغیر جنگ کرنیکے واپس آنا کس امر کی شہادت دیتا ہے۔ کیا اسقدر جرار فوج کے ہوتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی چھوٹی موٹی قوم کو بھی مسلمان نہ کر سکتے تھے حالانکہ آپکے پاس پاس نہ صرف عیسائی بلکہ بت پرست قومیں بھی موجود تھیں۔ مجھے پادری صاحبان کی اس حماقت پر بہت افسوس آتا ہے کہ بلا سوچے سمجھے اعتراض کرتے چلے جاتے ہیں۔ گویا انکے نزدیک اسلام پر اعتراض کرنا ہی سب سے بڑھکر ثواب کا کام ہے۔

دوسری آیت جو اسی دعویٰ کی تائید میں پیش کی گئی ہے۔ سورہ توبہ کی یہ آیت ہے۔ یا ایھا النبی جاھد الکفار والمنفقین واغلظ علیھم وماوٰھم جھنم وبئس المصیر۔ اسے پیغمبر جہاد کر کافروں اور منافقوں سے اور انپر سختی کر انکا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بُری جگہ ہے۔ یہاں جہاد کو تلوار کا جہاد نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ وہی جہاد ہے جسکا حکم سورۃ الفرقان میں بھی ہے وجاھدھم بہ جھادا کبیرا۔ کیونکہ اسجگہ جہاد کا حکم کفار اور منافقین دونوں کے لیے دیا گیا ہے۔ مگر منافقوں کے ساتھ تلوار کا جہاد کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا حالانکہ

اس آیت میں بالخصوص نبی ہی مخاطب ہے۔ اگر کوئی کہے کہ آپ کا منافقوں کے ساتھ جہاد نہ کرنا اس وجہ سے تھا کہ آپکو منافقوں کا علم نہ تھا تو یہ بات غلط ہے کیونکہ اسی سورۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ منافقوں کو خوب جانتے تھے یہ وہ لوگ تھے جو جنگ کے وقت آپکے ساتھ شامل نہیں ہوئے۔ اور خدائے تعالیٰ کا یہ حکم دینا کہ انکا جنازہ نہ پڑھا جائے اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو منافقوں کا علم تھا کیونکہ اگر علم نہ ہوتا تو اس حکم کی تعمیل نہ ہوسکتی تھی کہ انکا جنازہ نہ پڑھا جائے پس جس صورت میں کافر اور منافق دونوں اسجگہ جہاد میں شامل ہیں اور منافقوں کے خلاف کبھی تلوار نہیں اُٹھائی گئی تو اس آیت سے یہ استدلال نہیں ہوسکتا کہ کافروں سے ہر حال میں اور ہمیشہ جنگ کیے جاویں بلکہ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسا مخالفت کریں اسی قسم کا جہاد بھی انسے ہونا چاہیئے۔ حکم تو صرف جہاد کا تھا مگر کافروں نے خود تلوار اُٹھائی اور اس لیے مسلمانوں کو بھی دین اسلام کی حفاظت کے لیے انکے مقابل پر تلوار اُٹھانی پڑی مگر منافقوں نے تلوار نہ اُٹھائی اسلیے باوجود انکو منافق جاننے کے مسلمانوں نے بھی کبھی انکے خلاف تلوار نہ اٹھائی۔ یہ ہے حقیقت جہاد کی جسپر پادری صاحبان دن رات شور مچا رہے ہیں۔ اصل جہاد میں تلوار شامل نہیں پر جیسا خود مسیح نے بھی کہا تھا جو تلوار کھینچتے ہیں وہ تلوار سے ہی مارے جاتے ہیں تلوار کا جہاد اسی کے مطابق ہوا۔

تیسری آیت سورہ توبہ کی ایک سو گیارھویں آیت ہے۔ ان اللہ اشترٰی من المؤمنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ یقاتلون فی سبیل اللہ فیقتلون ویُقتلون۔ مَیں نہیں جانتا اس آیت سے کسطرح بجبر مسلمان کرنیکا استدلال کیا گیا ہے۔ یہ تو ذکر ہے کہ مومن لوگ اللہ کی راہ میں لڑ رہے ہیں پس وہ دشمنوں کو مارتے بھی ہیں اور خود بھی قتل ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ تم ہمیشہ کافروں سے لڑتے رہو بلکہ ایک امر واقعہ کا بیان ہے کہ مسلمان لڑ رہے ہیں یہ لڑائیاں وہی تھیں جن کے متعلق مَیں دکھا چکا ہوں کہ بجبر مسلمان کرنیکے لیے ہرگز نہ تھیں بلکہ دین اسلام کی حفاظت کے لیے تھیں۔ جیسا کہ مفصل ذکر ہو چکا۔ چوتھی آیت یہ ہے۔ یا ایھا الذین اٰمنوا قاتلوا الذین یلونکم من الکفار ولیجدوا فیکم غلظۃ۔ اس میں صحابہؓ کو یہ حکم ہے کہ ان کافروں سے جنگ کرو جو تمہارے آس پاس ہیں۔ اور یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے مسلمانوں کو طرح طرح کے دکھ دیئے تھے۔ اور اب بھی مسلمان انکے فتنہ سے امن میں نہ تھے بلکہ یہ لوگ عہد کرتے اور پھر عہد شکنی کرتے تھے جیسا کہ ایکدفعہ ستّر قاری ایک قوم کے ہمراہ بھیجے گئے جنھوں نے یہ ظاہر کیا تھا۔ کہ ہم مسلمان ہونا چاہتے ہیں اور پھر جب وہ انکی بستی میں پہنچ گئے تو سب کو قتل کر دیا گیا۔ اسی قسم کی قومیں تھیں جن سے لڑنے کا حکم تھا۔ یہ آیت تو بجائے جنگ کے حکم کو عام کرنے کے اسے خاص کرتی ہے اور اسکو استدلال میں پیش کرنا محض پادری صاحبان کی بے سمجھی ہے۔ معترض نے دعویٰ تو یہ کیا ہے کہ مَیں نے سورہ توبہ کو بغور پڑھ لیا ہے لیکن اگر وہ غور سے پڑھ لیتا تو ایسے اعتراض کرنے سے اُسے ضرور شرم آتی۔ ایک ہی آیت اس بات کے ثبوت کے لیے کافی تھی جو اسی سورۃ کے شروع میں ہے۔ الا تقاتلون

قوماً نکثوا ایمانہم وھموا باخراج الرسول وھم بدءوکم اول مرۃ ؕ تم ان لوگوں سے کیوں جنگ نہ کرو جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑ ڈالا۔ اور رسول کے نکال دینے کا ارادہ کیا اور تلوار اٹھانے میں بھی پہل انہوں نے ہی کی۔ دوسری جگہ فرمایا کہ ان لوگوں سے جنگ نہ کرو جنہوں نے عہد نہیں توڑا۔ الا الذین عاھدتم من المشرکین ثم لم ینقصوکم شیئاً ولم یظاھروا علیکم احدا فاتموا الیہم عھدھم الی مدتھم۔

میں نے صرف ایپی فینی کے اعتراضوں کا جواب دیا ہے لیکن چونکہ زیادہ لکھنے کی اس رسالہ میں گنجائش نہیں اسلیے مقابلہ کے زیادہ دلچسپ حصہ کو دوسرے رسالہ پر ملتوی کرتا ہوں۔

میری اپیل

یہ اپیل میں تمام احمدی انجمنوں اور تمام احمدی احباب کے سامنے پیش کرتا ہوں اور ان تمام احباب کی خدمت میں جن کے ہاتھ میں یہ رسالہ آئے یہ میری التجا ہے کہ وہ ان لوگوں تک جن کے پاس رسالہ نہیں جاتا اس اپیل کو جس طرح ممکن ہو پہنچا دیں اور تمام احمدی انجمنیں اپنے خاص جلسے کرکے اور تمام احمدی احباب کو بلا کر یہ اپیل انکے سامنے پیش کریں۔

میری اس اپیل کی بنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد پر ہے جس کو شایع ہوئے پورے تین سال کا عرصہ گذر چکا ہے۔ اس لیے سب سے اول میں اس مبارک ارشاد کو پیش کرتا ہوں جو حسب ذیل ہے۔

"چونکہ ہماری تمام جماعت کو معلوم ہوگا کہ اصل غرض خدا تعالیٰ کی میرے بھیجنے سے یہی ہے کہ جو جو غلطیاں اور گمراہیاں عیسائی مذہب نے پھیلائی ہیں ان کو دور کرکے دنیا کے عام لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کیا جائے اور اس غرض مذکورہ بالا کو جس کو دوسرے لفظوں میں احادیث صحیحہ میں کسر صلیب کے نام سے یاد کیا گیا ہے پورا کیا جائے اس لیے اور انہیں اغراض کے پورا کرنے کے لیے رسالہ انگریزی جاری کیا گیا ہے جس کا مفہوم یعنی شایع ہونا امریکہ اور یورپ کے اکثر حصوں میں بخوبی ثابت ہو چکا ہے اور بہت سے دلوں پر اثر ہونا شروع ہو گیا ہے بلکہ امید سے زیادہ اس رسالہ کی شہرت ہو چکی ہے اور لوگ نہایت سرگرم شوق سے اس رسالہ کے منتظر پائے جاتے ہیں لیکن تاہم اس رسالہ کے شایع ہونے کے لیے مستقل سرمایہ کا انتظام کافی نہیں۔ اگر خدانخواستہ یہ رسالہ کم توجہی اس جماعت

بند ہو گیا تو یہ واقعہ اس سلسلہ کے لیے ایک ماتم ہو گا۔ اس لیے میں پورے زور کے ساتھ اپنی جماعت کے مخلص جوانمردوں کو
اس طرف توجہ دلاتا ہوں کہ وہ اس رسالہ کی اعانت اور مالی امداد میں جہانتک انسے ممکن ہے اپنی ہمت دکھلادیں
دنیا جائے گذشتنی و گذاشتنی ہے اور جب انسان ایک ضروری وقت میں ایک نیک کام کے بجالانے میں پوری
کوشش نہیں کرتا تو پھر وہ گیا ہوا وقت ہاتھ نہیں آتا۔ اور خود میں دیکھتا ہوں کہ بہت سا حصہ عمر کا گذار چکا ہوں
اور الہام الٰہی اور قیاس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ باقی ماندہ تھوڑا حصہ ہے پس جو کوئی میری موجودگی اور میری
زندگی میں میری منشاء کے مطابق میری اغراض میں مدد دیگا میں امید رکھتا ہوں کہ وہ قیامت میں بھی میرے
ساتھ ہو گا۔ اور جو شخص ایسی ضروری مہمات میں مال خرچ کریگا میں امید نہیں رکھتا کہ اس مال کے خرچ سے
اسکے مال میں کچھ کمی آجائے گی۔ بلکہ اس کے مال میں برکت ہوگی۔ پس چاہیئے کہ خدا تعالیٰ پر توکل کر کے پورے
اخلاص اور جوش اور ہمت سے کام لیں کہ یہی وقت خدمت گذاری کا ہے پھر بعد اس کے وہ وقت آتا ہے کہ ایک
سونے کا پہاڑ بھی اس راہ میں خرچ کریں تو اسوقت کے پیسہ کے برابر نہیں ہوگا یہ ایک ایسا مبارک وقت ہے کہ تم
میں وہ خدا کا فرستادہ موجود ہے جسکا صدہا سال سے اُمتیں انتظار کر رہی تھیں۔ اور ہر روز خدا تعالیٰ کی تازہ
وحی تازہ بشارتوں سے بھری ہوئی نازل ہو رہی ہے اور خدا تعالیٰ نے متواتر ظاہر کر دیا ہے کہ واقعی اور قطعی طور پر
وہی شخص اس جماعت میں داخل سمجھا جائیگا کہ اپنے عزیز مال کو اس راہ میں خرچ کریگا۔ یہ ظاہر ہے کہ تم دو چیز سے
محبت نہیں کر سکتے اور تمہارے لیے ممکن نہیں کہ مال سے بھی محبت کرو اور خدا سے بھی۔ صرف ایک سے محبت
کر سکتے ہو پس خوش قسمت وہ شخص ہے کہ خدا سے محبت کرے اور اگر کوئی تم میں سے خدا سے محبت کر کے اسکی راہ میں
مال خرچ کریگا تو میں یقین رکھتا ہوں کہ اس کے مال میں بھی دوسروں کی نسبت زیادہ برکت دیجائیگی کیونکہ مال
خود بخود نہیں آتا بلکہ خدا کے ارادہ سے آتا ہے پس جو شخص خدا کے لیے بعض حصہ مال کا چھوڑتا ہے وہ ضرور
اسے پائیگا لیکن جو شخص مال سے محبت کر کے خدا کی راہ میں وہ خدمت بجا نہیں لاتا جو بجا لانی چاہیئے تو وہ ضرور
اس مال کو کھوئے گا۔ یہ مت خیال کرو کہ مال تمہاری کوشش سے آتا ہے بلکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے۔ اور یہ مت
خیال کرو کہ تم کوئی حصہ مال کا دیکر یا کسی اور رنگ سے کوئی خدمت بجا لا کر خدا تعالیٰ اور اسکے فرستادہ پر کچھ احسان کرتے
ہو بلکہ یہ اسکا احسان ہے کہ تمھیں اس خدمت کے لیے بلاتا ہے۔ اور میں سچ سچ کہتا ہوں کہ اگر تم سب کے سب مجھے
چھوڑ دو اور خدمت اور امداد سے پہلو تہی کرو تو وہ ایک قوم پیدا کر دیگا کہ اسکی خدمت بجا لائیگی تم یقیناً سمجھو کہ یہ کام
آسمان سے ہے اور تمہاری خدمت صرف تمہاری بھلائی کے لیے ہے۔ پس ایسا نہ ہو کہ تم دل میں تکبر کرو اور یا
یہ خیال کرو کہ ہم خدمت مالی یا کسی قسم کی خدمت کرتے ہیں۔ میں بار بار تمہیں کہتا ہوں کہ خدا تمہاری خدمتوں کا
ذرا محتاج نہیں ہاں تم پر یہ اسکا فضل ہے کہ تم کو خدمت کا موقع دیتا ہے تھوڑے دن ہوئے کہ بمقام گورداسپور مجھ کو

الہام ہوا تھا کہ لا الٰہ الّا انا فاتخذنی وکیلا۔ یعنی میں ہی ہوں کہ ہر ایک کام میں کارساز ہوں پس تو مجھ کو ہی وکیل یعنی کارساز سمجھ لے اور دوسروں کا اپنے کاموں میں کچھ بھی دخل مت سمجھ۔ جب یہ الہام مجھ کو ہوا تو میرے دل پر ایک لرزہ پڑا اور مجھے خیال آیا کہ میری جماعت ابھی اس لایق نہیں کہ خدا تعالیٰ انکا نام بھی لے اور نہ مجھے اس سے زیادہ کوئی حسرت نہیں کہ میں فوت ہو جاؤں اور جماعت کو ایسی ناتمام اور خام حالت میں چھوڑ جاؤں میں یقیناً سمجھتا ہوں کہ بخل اور ایمان ایک ہی دل میں جمع نہیں ہو سکتے جو شخص سچے دل سے خدا تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے وہ اپنا مال صرف اس مال کو نہیں سمجھتا کہ اسکے صندوق میں بند ہے بلکہ وہ خدا تعالیٰ کے تمام خزائن کو اپنے خزائن سمجھتا ہے اور امساک اس سے اسطرح دور ہو جاتا ہے جیسا کہ روشنی سے تاریکی دور ہو جاتی ہے اور یقیناً سمجھو کہ صرف یہی گناہ نہیں کہ میں ایک کام کے لیے کہوں اور کوئی شخص میری جماعت میں سے اسکی طرف کچھ التفات نہ کرے بلکہ خدا تعالیٰ کے نزدیک یہ بھی گناہ ہے کہ کوئی کسی قسم کی خدمت کرکے یہ خیال کرے کہ میں نے کچھ کیا ہے۔ اگر تم کوئی نیکی کا کام بجالاؤ گے۔ اور اسوقت کوئی خدمت کرو گے تو اپنی ایمانداری پر مہر لگا دو گے۔ اور تمھاری عمریں زیادہ ہونگی اور تمھارے مالوں میں برکت دیجائیگی۔ مجھے اس بات کی تصریح کی ضرورت نہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا خدمت بجالاتے تھے۔ اب تم سوچکر دیکھو کہ یہ خدمات ان خدمات کے مقابل پر کیا چیز ہیں۔ میں تم میں بہت دیر تک نہیں رہونگا۔ اور وہ وقت چلا آتا ہے کہ تم پھر مجھے نہیں دیکھو گے اور بہتوں کو حسرت ہوگی کہ کاش ہم نے نظر کے سامنے کوئی قابل قدر کام کیا ہوتا سو اسوقت ان حسرات کا جلد تدارک کرو جسطرح پہلے نبی رسول اپنی امت میں نہیں رہے میں بھی نہیں رہونگا۔ سو اسوقت کا قدر کرو اور اگر تم اسقدر خدمت بجالاؤ کہ اپنی غیر منقولہ جائدادوں کو اس راہ میں بیچ دو پھر بھی ادب سے دور ہوگا کہ تم خیال کرو کہ ہم نے کوئی خدمت کی ہے تمھیں معلوم نہیں کہ اسوقت رحمت الٰہی اس دین کی تائید میں جوش میں ہے اور اس کے فرشتے دلوں پر نازل ہو رہے ہیں۔ ہر ایک عقل اور فہم کی بات جو تمھارے دل میں ہے وہ تمھاری طرف سے نہیں بلکہ خدا کی طرف سے ہے آسمان سے عجیب سلسلہ انوار جاری اور نازل ہو رہا ہے پس میں بار بار کہتا ہوں کہ خدمت میں جان توڑ کر کوشش کرو مگر دل میں مت لاؤ کہ ہم نے کچھ کیا ہے اگر تم ایسا کرو گے ہلاک ہو جاؤ گے یہ تمام خیالات ادب سے دور ہیں اور جسقدر بے ادب جلد تر ہلاک ہو جاتا ہے ایسا جلد کوئی ہلاک نہیں ہوتا اور میں یہ بھی کہتا ہوں کہ اس خدمت کے ساتھ دوسری خدمات میں بھی سست مت ہو بہت نادان وہ شخص ہے کہ وہ اگر کوئی نیکی کرتا ہے تو اسطرح پر کہ ایک نیکی میں فتور ڈال کر دوسری نیکی بجالاتا ہے وہ خدا کے نزدیک کچھ چیز نہیں بلکہ تم ان نیکیوں اور خدمتوں کو بھی اپنے دستور کے مطابق بجالاؤ اور یہ نئی خدمت جو بتائی جاتی ہے اسمیں بھی پوری کوشش کا نمونہ دکھاؤ۔ اگر اس رسالہ کی اعانت کے لیے اس جماعت میں دس ہزار خریدار اردو یا انگریزی کا پیدا ہو جائے تو یہ رسالہ خاطر خواہ چل نکلے گا اور میری دانست میں

اگر بیعت کرنیوالے اپنی بیعت کی حقیقت پر قایم رہ کر اس بارہ میں کوشش کریں تو اسقدر تعداد کچھ بہت نہیں۔ بلکہ جماعت موجودہ کی تعداد کے لحاظ سے یہ تعداد بہت کم ہے سوائے جماعت کے سچے مخلصو! خدا تمہارے ساتھ ہو۔ تم اس کام کے لیے ہمت کرو۔ خدا تعالیٰ آپ تمہارے دلوں میں القا کرے کہ یہی وقت ہمت کا ہے۔ اب اس سے زیادہ کیا لکھوں۔ خدا تعالیٰ آپ لوگوں کو توفیق دیوے۔ آمین ثم آمین۔ الراقم خاکسار میرزا غلام احمدؐ"

میرے دوستو! اس ارشاد واجب التعمیل کو نقل کرنیکے بعد مجھے اپنی اپیل کے لیے کسی دلیل کے پیش کرنیکی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ تین سال ہوئے آپ لوگوں کو یہ کہا گیا تھا کہ آپ ہمت کر کے دس ہزار خریدار اس رسالہ کا پیدا کر دیں اور یاد رکھو کہ یہ دس ہزار خریدار باہر کے لوگوں سے نہیں بلکہ حضرت اقدسؑ کی خواہش کے مطابق اس جماعت میں سے ہونا چاہیے میں ارشاد کے آخری الفاظ کو اس غرض کیلیے پھر دہراتا ہوں "اگر اس رسالہ کی اعانت کے لیے اس جماعت میں سے دس ہزار خریدار اردو یا انگریزی کا پیدا ہو جائے۔ تو یہ رسالہ خاطر خواہ چل نکلیگا اور میری دانست میں اگر بیعت کرنیوالے اپنی بیعت کی حقیقت پر قایم رہ کر اس بارہ میں کوشش کریں تو اسقدر تعداد کچھ بہت نہیں بلکہ جماعت موجودہ کی تعداد کے لحاظ سے یہ تعداد بہت کم ہے سوائے جماعت کے سچے مخلصو خدا تمہارے ساتھ ہو۔ تم اس کام کے لیے ہمت کرو" اب آپ لوگ خود ہی غور کر لیں کہ کیا آپ نے ایسی ہمت کی اور دس ہزار خریدار ایک نہیں تین سال کے عرصہ میں پیدا کر دیا؟

جن دنوں میں یہ ارشاد شایع ہوا تھا ان دنوں میں چار سو سے سولہ سو تک اردو رسالہ کے خریداروں کی تعداد ضرور بڑھ گئی تھی مگر اس کے بعد قریباً تین سال کے اندر وہ تعداد وہیں کی وہیں رہی یا بمشکل اگر ترقی ہوئی تو ڈیڑھ یا دو سو خریدار کی۔ اس میں بھی شک نہیں کہ بہت سے مخلص احباب ایسے ہیں جنہوں نے اعانت رسالہ میں بڑی بڑی رقمیں دیں اور بہت سے مخلصوں نے دو دو چار چار دس دس بیس بیس خریدار رسالہ کے پیدا کیے۔ مگر میں افسوس سے کہتا ہوں کہ ابھی تعداد مطلوبہ کے چوتھے حصہ تک ہم پہنچے ہیں۔ غیر احمدی لوگوں کو خریداری کی ترغیب دینا یہ ایک بالکل الگ امر ہے پہلے احمدی جماعت میں جسقدر خریدار ہو سکتے ہیں انکو تو خریدار بنایا جاوے۔ ایک ایک شہر جس میں جماعت کے خواندہ اشخاص کی تعداد دو دو تین تین سو تک پہنچی ہوئی ہے وہاں اگر رسالہ دیکھا جاوے تو پندرہ بیس سے زیادہ نہیں جاتے۔ اس سستی کی وجہ میں سوائے اس کے کچھ نہیں دیکھتا کہ اس ارشاد کو جماعت کے بہت لوگوں نے مدنظر نہیں رکھا۔ یا بوجہ زیادہ عرصہ گذر جانیکے فراموش کر دیا ہے۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ اگر تمام احمدی انجمنیں متفق ہو کر یہ کوشش کریں کہ انکا کوئی ممبر سوائے ایسی صورتوں کے جہاں انجمن اسے معذور تصور کرے خریداری رسالہ سے باہر نہ رہے اور جو لوگ انگریزی بھی سمجھ سکتے ہیں وہ انگریزی اور اردو دونوں رسالوں کو خریدیں تو چند ہی ماہ میں دس ہزار کی تعداد پوری ہو سکتی ہے۔ جماعت میں سیکڑوں نہیں ہزاروں خواندہ آدمی ایسے موجود ہیں جو رسالہ کو نہیں خریدتے۔ مگر خواندہ تو ایک طرف رہے حضرت اقدسؑ کے ارشاد کی تعمیل واجب نہیں بلکہ یہ خریداری بطور اعانت بھی اور ناخواندہ لوگوں کو بھی یہ رسالہ خریدنا چاہیے تھا

مَیں اس بات کے تسلیم کرنے میں بھی حرج نہیں سمجھتا کہ بلحاظ مضامین آپ کی نظروں میں اس رسالہ کی چنداں وقعت نہ ہو مگر مَیں اس بنا پر یہ تحریک بھی نہیں کرتا کہ اس رسالہ کے مضامین عمدہ ہیں اس لیے اسے خریدنا چاہیئے۔ میری تحریک کی بنا حضرت اقدسؑ کا ارشاد ہے۔ پس رسالہ خواہ اچھا ہو یا بُرا اسکا خریدنا امام کی اطاعت کیلیے ہے۔ مَیں صرف آپ لوگوں کی خدمت میں یہ اپیل کرتا ہوں کہ آپ اس ارشاد کو ایک مرتبہ دو مرتبہ دس مرتبہ پڑھیں اور غور کریں کہ آپ کا امام جسکے ہاتھ پر آپنے دین کو دنیا پر مقدم کرنیکا اقرار کیا ہے آپ لوگوں سے کیا چاہتا ہے۔ یہ رسالہ کسی شخص کے ذاتی فایدہ کے لیے نہیں بلکہ یہ سلسلہ احمدیہ کی ایک شاخ ہے اور جہانتک مَیں سمجھتا ہوں نہایت ضروری شاخ ہے۔ غیر ممالک میں اشاعت اسلام کا کام اس رسالہ کے ذریعہ ہو رہا ہے۔ وہاں اس رسالہ نے کیا اثر پیدا کیا ہے ہمینے کئی بار ان صفحات میں ذکر اسکا بھی کیا ہے اور عنقریب ایک مختصر رسالہ میں بھی کسی قدر تفصیل کے ساتھ یہ ذکر کیا جائیگا۔ لیکن ضرورت ہے اسبات کی کہ سفت اشاعت اسکی زیادہ ہو اور اسکی صرف یہی سبیل ہے کہ اردو اور انگریزی کے خریدار پیدا کر کے اسکی بنا کو مستحکم کیا جاوے۔ پس مَیں مکرر تمام احباب کی خدمت میں التماس کرتا ہوں کہ جہاں کہیں باقاعدہ انجمنیں بنی ہوئی ہیں وہ اپنا اجلاس کر کے اور جہاں انجمنیں نہیں وہاں سب احمدی احباب ملکر اس امر کا فیصلہ کریں کہ آیا موجودہ صورت میں حضرت اقدسؑ کے ارشاد کی تعمیل انکی انجمن کے تمام ممبر کر چکے ہیں؟ اور آیا رسالہ کی موجودہ اشاعت جو انگریزی اور اردو کو ملا کر تین ہزار تک بھی ابھی نہیں پہنچی انکو مطمئن کرتی ہے کہ وہ اپنا فرض اس ارشاد کے متعلق ادا کر چکے ہیں؟ ان دو سوالوں کے جواب میں ہر جگہ سے جہاں کوئی بھی احمدی موجود ہے سننے کا منتظر رہونگا اور جو کارروائی کسی جگہ ہوئی ہوگی اسکی مختصر کیفیت آیندہ رسالے میں انشاء اللہ تعالیٰ چھاپ دیجاویگی۔

ساتھ ہی مَیں اس امر کا اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ چونکہ چندہ کی مابعد وصولی میں دفتر کا بہت سا نقصان ہوتا ہے اور بار بار مطالبہ کے خطوط لکھنے پڑتے ہیں اس لیے جو احباب نئے خریدار بنیں انسے چندہ پیشگی وصول ہونا چاہیئے خواہ سال کا پورا ہو یا چھ ماہ کا۔ اور پرانے خریداروں کو بھی چاہیئے کہ اختتام سال سے پہلے نئے سال کا چندہ ارسال کر دیں۔ بدون پیشگی وصولی چندہ آیندہ رسالہ جاری نہ ہوگا۔ ہاں یہ اختیار ہوگا کہ پہلا پرچہ بذریعہ وی پی طلب کر لیں۔

ہمارے مسلمان ہمعصر

ہمارے مسلمان معاصرین باستثنائے دو تین معزز پرچوں کے کسی اچھے موقع پر ہمارا نام لینے میں پبلک سے ایسی خوف کا اظہار کرتے ہیں جو اخبار نویسی کے منصب کو شایاں نہیں۔ اخبار نویس کا اصل غرض ہوتا ہے کہ وہ پبلک کو کسی غلطی سے نکالنے کی کوشش کرے نہ یہ کہ پبلک کے ڈر سے خود اسی غلطی کا ارادتاً ارتکاب کرے جسمیں پبلک پھنسی ہوئی ہو۔ جب سے یہ رسالہ جاری ہوا ہے اسکے مضامین کو عموماً پسندیدگی

کی نظر سے دیکھا گیا ہے اور اہل الرائے مسلمانوں نے اس بات کو تسلیم کیا ہے مگر ہمارے مسلمان اخبار نویس اس خوف سے کہ مبادا انکی ہکری میں کچھ کمی ہو جائے سوائے مخالفت کے رنگ کے ہمارا ذکر ہرگز نہیں کرتے - یہ رسالہ ایک مذہبی رسالہ ہے اور ہمارے معاصرین کو خوب علم ہے کہ بیرونی دنیا میں اسلام کے متعلق تبدیل خیالات کرنے میں یہ کتنا بڑا کام کر رہا ہے - پس یہ کام ایسا تھا جس میں سب مسلمان برابر شریک ہوتے - اور ان کو چاہیئے تھا کہ اہل اسلام کو اس طرف توجہ دلاتے ہاں یہ ان کا حق تھا کہ جن مضامین میں ان کو اس پرچہ سے اختلاف تھا ان کا ذکر بھی کرتے اور پبلک کو کسی غلطی میں نہ رکھتے - مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ سوائے ایک دو پرچوں کے یہ اخلاقی جرأت کسی میں نہ پائی گئی - بلکہ بہت سے رسالے جن میں اس رسالے کے مضامین نقل بھی کیے جاتے ہیں وہ اخیر پر اتنا حق بھی ادا نہیں کر سکتے کہ **ریویو آف ریلیجنز قادیان** کا پورا نام لکھدیں بلکہ صرف لفظ ریویو اور وہ بھی کسی قدر بگاڑ کر لکھدیتے ہیں جس سے ہرگز یہ پتہ نہیں لگ سکتا کہ ریویو آف ریلیجنز سے یہ مضمون لیا گیا ہے ہم کسی بات کی التجا نہیں کرتے اور نہ انسے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ کسی طرح سے اشاعت اسلام کے کام میں ہماری مدد کریں گے مگر جس صورت میں وہ اس پرچے سے مضامین کا انتخاب کرتے ہیں انپر واجب ہے کہ وہ وہی سلوک اس سے کریں جو معزز ہمعصر ایکدوسرے سے کرتے ہیں یعنی اگر وہ مضامین لیں تو ساتھ پورا نام بھی شایع کر دیں کہ **ریویو آف ریلیجنز قادیان** سے لیا گیا ہے بلکہ جہاں سے مضمون شروع ہو وہاں یہ اعتراف ہونا چاہیئے۔

اسی جگہ میں سیالکوٹ کے رسالہ **الھادی** کا ذکر بھی کرتا ہوں - اس رسالہ میں تاویل القرآن مصنفہ اکبر مسیح کے رسالہ کا جواب بعنوان تائید القرآن نکل رہا ہے - اور ایڈیٹر صاحب یا منیجر صاحب رسالہ ہذا نے اس مضمون کو بندا سے میرے پاس بھیجا ہے - جہانتک یہ مضمون ابتک پہنچا ہے اس میں ابھی تمہیدی امور پر بحث ہے - اور اصل اعتراضات تاویل القرآن کے ابھی باقی ہیں - اس لیے میں اسپر کوئی رائے زنی نہیں کرتا جب تک کہ کل مضمون یا اسکا بڑا حصہ شایع نہ ہو لے - لیکن مجھے ایک بات پر تعجب آیا ہے کہ جہاں پادری اکبر مسیح نے امام الدین - چراغ الدین اور مولوی عبداللہ چکڑالوی کا ذکر کیا ہے اور ان تینوں کو اسلام کے بڑے محقق قرار دیا ہے - وہاں جواب لکھتے وقت ایڈیٹر صاحب رسالہ مذکور نے اپنی تہذیب کے تمام دعووں کو جو ابتدائے رسالہ میں کیے تھے خیر باد کہکر حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کا ذکر بلاضرورت درمیان میں کیا اور او نہی سفیہانہ الفاظ کو استعمال کیا جن کے وہ مدت سے عادی ہو رہے ہیں انکی عبارت یہ ہے "اور چراغدین بیچارہ تو تھا ہی بے علم محض اور زبان عربی سے کلیۃً نابلد - ہاں کچھ مدت تک مرزا صاحب کی پارٹی میں شامل رہنے کی وجہ سے تاویل کرنے اور بات بنانے اور بڑھانے اور ادھر اُدھر کی تک چلانیکا ملکہ ہو گیا تھا - مرزا صاحب کی تائید میں چند الہام گھڑ دیئے اور وہ الہام بظاہر تو مرزا صاحب کے بہت مفید مطلب تھے۔ کہ اس میں مرزا صاحب کے لیے بنی بنائی صداقت دکھائی گئی تھی مگر باطن میں مرزا صاحب اور انکے مشن اور انکے چند مقرب حاشیہ نشین مہاجرین کے لیے نہایت مضر تھے کیونکہ اگر مرزا صاحب ان الہاموں کی تصدیق کرتے تو مریدوں کا رُخ شیخ چراغدین صاحب کی طرف پھر جاتا اور مرزا صاحب کو چندہ بہت کم وصول ہوتا اسلیے مرزا صاحب نے بڑے زور سے اسکی تکذیب کی اور نہایت زجر و توبیخ سے اسی توبہ کرنیکا حکم کیا - وہ بیچارہ بمصداق دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا ادھر اُدھر مارا پھرا کیونکہ مرزا صاحب بحکم گاہے سلامے بر نجشد اس تعریف سے جس کی تصدیق سے شیخ صاحب کی دوکان مرزا صاحب کے مقابلے میں رونق پر ہوتی - نہایت آشفتہ ہوئے - اور ادھر مسلمان تو آگے ہی انکے مخالف اور اس الہام کے بھی مخالف تھے...... ابھی وہ اس زینہ پر چڑھ ہی رہے تھے کہ دست اجل نے ایک ایسا دھکا دیا کہ اُٹھا کر کے قبر میں جا پھینکا اور دعویٰ مہدیت و مسیحیت کی ساری امیدیں غلط کر دیں" جس چراغ کو خدا نے اپنے ہاتھ سے جلایا ہے وہ انسانوں کی موںنہ کی پھونکوں سے بجھ نہیں سکتا اور اگر یہ لوگ اس سلسلہ کو دوکانداری قرار دیتے ہیں تو پہلوں کو بھی یہی کہا گیا اِنَّ ھٰذَا الشَّیْءُ یُّرَادُ - مولوی ابراہیم صاحب (کیونکہ یہی اس رسالہ کے ایڈیٹر ہیں) اس بات سے بیخبر نہیں کہ چراغدین کو انہی ناپاک باتوں کی وجہ سے اس سلسلہ سے خارج کیا گیا تھا - اور ایک پیشگوئی بھی حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اسکی ہلاکت اور تباہی کے متعلق کی تھی جسکے مطابق یہ شخص ہلاک ہوا - پس اس موقع پر ذکر تو یہ کرنا چاہیئے تھا اور اس میں اسلام کی عزت تھی کہ جب اس شخص نے ایک ناپاک رسالت کا دعویٰ کیا جس سے وہ عیسائی مذہب کی تائید اور اسلام کی تردید کرنا چاہتا تھا تو ایک سچے مسلمان نے خدا سے خبر پا کر اسکی ہلاکت کی پیشگوئی کی اور تھوڑے دنوں میں ہی وہ اس پیشگوئی کے مطابق ہلاک ہوا اور دوسرا

پھر انکو چھوڑ کر ایڈیٹر الھادی نے ناحق کی نیش زنی کی

۲۷ ستمبر ۱۹۰۶ء۔ بلجت آیاتی۔ و بشر الذین آمنوا ان لھم الفتح۔ ترجمہ۔ ظاہر ہو گئیں میری نشانیاں اور خوشخبری دے اُن لوگوں کو جو ایمان لائے۔ بیشک ان کے واسطے فتح ہے۔ ۲۔ اکتوبر ۱۹۰۶ء۔ لنبلونّکم ترجمہ۔ البتہ ہم تم کو آزمائیں گے۔ رؤیا مینے دیکھا کہ ایک کتاب ہے گویا وہ میری کتاب ہے اسکا نام نھج المصلیٰ ہے پھر الہام ہوا۔ فوق حمیدٌ۔ کاذب کا خدا دشمن ہے۔ وہ اُس کو جہنّم میں پہنچائیگا۔ ۹۔ اکتوبر ۱۹۰۶ء مینے آج رات خواب میں دیکھا کہ میرا بھائی مرزا غلام قادر مرحوم ایک مضبوط گھوڑے پر سوار ہے اور مینے خیال کیا کہ یہ فرشتہ ہے اور لفظ قادر کی مناسبت سے اُس شکل پر ظاہر ہوا ہے اور میں اسکے آگے اسقدر دوڑتا ہوں کہ گھوڑا پیچھے رہ جاتا ہے اسکے بعد ہم شہر میں داخل ہو گئے اور وہ فرشتہ جو میرے بھائی کی شکل پر تھا گھوڑے پر سے اُتر آیا اور اس کے ہاتھ میں ایک تازیانہ ہے اور ایک مضبوط سپاہی قوی ہیکل شکل میں ہے اور ہمنے شہر میں ایک طرف جانیکا ارادہ کیا گویا کوئی کام ہے یا کوئی خدمت ہے جو اس فرشتہ نے بجالانی ہے بعد اس کے الہام ہوا۔ اے عبد الحکیم خدا تعالیٰ تجھے ہر ایک ضرر سے بچاوے اندھا ہونے اور مفلوج ہونے اور مجذوم ہونے سے۔ اور میرے دل میں ڈالا گیا کہ عبد الحکیم میرا نام رکھا گیا ہے۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت نہیں چاہتی کہ ان بیماریوں میں سے کوئی بیماری میرے لاحق حال ہو۔ کیونکہ اس میں شماتت اعدا ہے۔

فہرست چندہ اعانت دہندگان بابت ماہ جون ۱۹۰۶ء

میاں نذیر الدین صاحب۔ بھاموں۔ عہ۔ معرفت منشی نعمت خاں صاحب۔ پشاور۔ للعہ۔ منشی مرزا سلطان صاحب۔ پشاور۔ ۱۵ر۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ صاحب۔ جھنگ۔ عہ۔ بابو برکت علی صاحب دھرمسالہ۔ عما۔ سردار محمد عجب خانصاحب تحصیلدار میرام شاہ۔ عہ۔ چودھری رستم علی صاحب۔ انبالہ۔ لعہ۔ بابو عبد الرحمن صاحب انبالہ عہ۔ نجف خاں صاحب۔ ضلع انبالہ۔ للعہ۔ جماعت مینی پور آسام۔ عہ۔ مولوی عبد اللہ صاحب چک ۲۹۶ لائلپور للعہ میاں محمد الدین صاحب۔ جدہ۔ لعہ۔ مرزا خدا بخش صاحب لاہور۔ صہ۔ مولوی عمر الدین صاحب۔ شملہ۔ عما۔ میاں عبد الرحمن صاحب۔ امرتسر۔ عہ۔ جماعت سیکھواں۔ عہ۔ منشی نبی بخش صاحب۔ راولپنڈی۔ للعہ۔ منشی ہاشم علی صاحب سردوانگددہ۔ عہ۔ محمد ظہور الدین صاحب۔ اکمل۔ عہ۔ منشی محمد علی صاحب۔ کسولی عہ۔ منشی یار محمد خانصاحب عہ۔ میاں نظام الدین صاحب۔ پہی۔ للعہ۔ ڈاکٹر سید جلال صاحب۔ بریرہ۔ لعہ۔ ماسٹر عبد الرحمن صاحب۔ قادیان۔ عما۔ ڈاکٹر الٰہی بخش معرفت بابو عبد العزیز صاحب۔ صہ۔ جماعت بنگہ معرفت میاں رحمت اللہ صاحب۔ صہ۔ منشی اکرام الحسن صاحب راولپنڈی للعہ ماسٹر عبد الحمید صاحب۔ سے بیو۔ للعہ۔

فہرست چندہ اعانت دہندگان ماہ جولائی سنہ ۱۹۰۶ء

جماعت لاہور ۔ ۱۱ر ۶ پائی ۔ جماعت ڈیرہ غازیخاں ۔ ۔ منشی عبدالخالق صاحب ۔ ڈیرہ غازیخاں ۔ ۔ مولوی عزیز بخش صاحب ڈیرہ غازیخاں ۔ ۔ میاں غلام محمد صاحب ۔ مہدی آباد ۔ ۔ منشی نورالدین صاحب ۔ لائل پور ۔ ۔ جماعت ۔ ۔ ۔ ۹ پائی بابو محمد شفیع صاحب ۔ گوجرانوالہ ۔ ۔ میاں ابراہیم صاحب ۔ امرتسر ۔ ۔ منشی محمد رفیق صاحب ۔ ۔ حافظ نوراحمد صاحب فیض اللہ چک ۔ ۔ بابو گلاب خاں صاحب ۔ راولپنڈی ۔ ۔ جماعت کپورتھلہ معرفت منشی حبیب الرحمن صاحب ۔ ۔ منشی اللہ بخش صاحب ۔ موضع دریالی ۔ ۔ منشی اللہ دتا صاحب ۔ مانگنانوالہ ۔ ۔ بابو فیروز علی صاحب ۔ مسہ کیسوال ۔ ۔ سید اسداللہ شاہ صاحب ۔ ۸ر ۔ ڈاکٹر بشارت احمد صاحب ۔ ۔ منشی رستم علی صاحب ۔ انبالہ ۔ ۔ منشی عبدالرحمن صاحب ۔ انبالہ ۔ ۔ محمد علی صاحب کسولی ۔ میاں محمد نظام الدین صاحب ۔ ماہل پور ۔ ۔ میاں غلام احمد صاحب ۔ کریام ۔ ۔ معرفت حافظ عبدالرحیم صاحب ۔ قادیان ۔ ۔ سید سرور شاہ صاحب موضع دانہ ۔ ۔ حکیم انوار حسین خانصاحب ۔ شاہ آباد ۔ ۔ منشی برکت علی خانصاحب ۔ ماڑی بوچیاں والہ ۔ ۔ میاں الہداد خانصاحب موضع محلانوالہ ۔ ۔ سید نادر علی شاہ صاحب ۔ چوہان ۔ ۔

فہرست چندہ اعانت دہندگان بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۰۶ء

مولوی غلام رسول صاحب ۔ موضع بجواڑہ ۔ ۔ منشی نذر محمد صاحب ۔ ضلع منٹگمری ۔ ۔ منشی گلاب خانصاحب ۔ راولپنڈی ۔ ۔ اہلیہ منشی گلاب خانصاحب ۔ جماعت احمدیہ معرفت منشی گلاب خانصاحب ۔ راولپنڈی ۔ ۔ جماعت لاہور معرفت حکیم محمد حسین صاحب قریشی ۔ ۔ شیخ محمد جانصاحب ۔ وزیرآباد ۔ ۔ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب ۔ موضع ترگڑی ۔ ۔ عالم گیر خانصاحب ۔ جبلپور ۔ ۔ بابو محمد شفیع صاحب ۔ گوجرانوالہ ۔ ۱۲ر ۔ جماعت احمدیہ معرفت اکمل آف گولیکی ۔ ۔ چودھری رستم علی صاحب انبالہ ۔ ۔ شیخ عبدالعزیز صاحب ۔ نومسلم ۔ قادیان ۔ ۔ محمد اکرم بیگ صاحب ۔ کوہاٹ ۸ر ۔ میاں محمد صدیق صاحب کوٹ احمد ۔ بابو شاہ دین صاحب لاہور ۔ ۔ بابو فقیر علی صاحب ۔ سٹہمار جا ۔ ۔ منشی ارادت حسین صاحب ۔ ادرین ۔ ۔ منشی ہاشم علی صاحب سردیہ ۔ منشی نصراللہ خانصاحب ۔ لدھیانہ ۔ ۔ منشی کریم بخش صاحب تحصیل نروانہ ۔ ۔ جماعت فیض اللہ چک معرفت حافظ نور احمد صاحب ۔ ۔ جماعت بنارس معرفت منشی عبدالرزاق صاحب ۔ ۔ یار محمد خانصاحب ۔ فارسٹر ۔ ریاست جموں ۔ ۔ بابو مظہر دین صاحب معرفت ابوالفتح محمد عبدالقادر صاحب ۔ نادر دل چک ۔ ۔ منشی محمد علی صاحب کسولی ۔ ۔ کے ۔ ایم ۔ بشیرالدین صاحب ۔ حیدرآباد سندھ ۔ ۔ بابو عبدالرحمن صاحب ۔ انبالہ ۔ ۔ منشی کرم نواز صاحب ۔ فلانہ ۔ ۔ بابو محمد رفیق صاحب ۔ بی ۔ اے ۔ ۔ شیخ تیمور صاحب ۔ قادیان ۔ ۔ ڈاکٹر محمد فیاض خانصاحب معرفت بابو محمد افضل صاحب ۔ قلعہ دانو ۔ ۔ میاں محمد نظام الدین صاحب ماہل پور حال مقیم قادیان ۔ ۔ شیخ نوراحمد صاحب وکیل ۔ ایبٹ آباد ۔ ۔ جماعت سیکھواں معرفت میاں امام الدین صاحب ۔ ۔

تحریک :- جناب منشی عبدالعزیز صاحب گوجرانوالہ اُس دورہ سے واپس آگئے ہیں جو انہوں نے اعانت میگزین کے لیے کیا تھا اور اب جناب ابوسعید عرب صاحب رنگون کو اسی غرض کے لیے اور نیز بقایا داران سے بقایا وصول کرنیکے لیے تشریف لیجاتے ہیں وہ صرف کلکتہ اور برما کی طرف جائیں گے ۔ اور اُنکو اختیار دیا گیا ہے کہ ان اطراف میں صدر انجمن احمدیہ کی طرف سے چندہ میگزین وصول کرکے رسیدیں دیں ۔ المشتہر ۔ سکرٹری صدر انجمن احمدیہ قادیان ۔

اعلان :- ہر ایک سامان کرکٹ ٹینس فٹبال وجمناسٹک وغیرہ مستری نظام الدین احمدی [illegible]

مطبع میگزین قادیان دارالامان میں مینجر میگزین کے اہتمام سے طبع ہوا ۔